# تاریخ اُردو زبان و ادب

مرتب

عابد میر

maablib.org

# تاریخ اُردو زبان و ادب

مرتب

عابد میر

maablib.org

گوشہ ادب
جناح روڈ، کوئٹہ

ز یم بخاری نے 2016ء میں
گوشۂ ادب کوئٹہ سے شائع کی


کتاب: تاریخ اردو زبان وادب

مرتب: عابد میر

ملنے کا پتہ:

سیلز اینڈ سروسز

کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ

فون: 092-81-2843229

فیکس: 092-81-2837672

# فہرست

## حصہ اول

### اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق نظریات


| | |
|---|---|
| پنجاب میں اردو | ۸ |
| دکن میں اردو | ۹ |
| سندھ میں اردو | ۱۰ |
| دہلی میں اردو | ۱۳ |


## حصہ دوم

### اُردو ادب کے ادوار


| | |
|---|---|
| دکنی دور | ۱۷ |
| میر و سودا کا دور | ۲۸ |
| دبستانِ دلی | ۳۰ |
| دبستانِ لکھنؤ | ۴۳ |

## حصہ سوم

# اُردو ادب کی تحریکات


| | |
|---|---|
| سرسید تحریک | ۵۹ |
| رومانی تحریک | ۶۹ |
| ترقی پسند تحریک | ۸۱ |


## حصہ چہارم

# اُردو کی ترقی میں مشہور ادارے


| | |
|---|---|
| فورٹ ولیم کالج | ۹۹ |
| انجمن ترقی اُردو | ۱۱۰ |
| انجمن پنجاب | ۱۱۶ |
| مجلس ترقی ادب | ۱۲۳ |


maablib.org

## حصہ اول

# اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق نظریات

maablib.org

# اُردو زبان کی ابتدا کے متعلق نظریات

زبانِ اردو کی ابتدا و آغاز کے بارے میں کئی مختلف و متضاد نظریات ملتے ہیں۔ یہ آپس میں اس حد تک متضاد ہیں کہ ایک انسان چکرا کر رہ جاتا ہے۔ ان مشہور نظریات میں ایک بات مشترک ہے کہ ان میں اردو کی ابتدا کی بنیاد برصغیر پاک و ہند میں مسلمان فاتحین کی آمد پر رکھی گئی ہے۔ اور بنیادی استدلال یہ ہے کہ اردو زبان کا آغاز مسلمان فاتحین کی ہند میں آمد اور مقامی لوگوں سے میل جول اور مقامی زبان پر اثرات و تاثر سے ہوا۔ اور ایک نئی زبان معرض وجود میں آئی جو بعد میں اردو کہلائی۔ کچھ ماہرینِ لسانیات نے اردو کی ابتدا کا سراغ قدیم آریاؤں کے زمانے میں لگانے کی کوشش کی ہے۔ بہر طور اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں کوئی حتمی بات کہنا ذرا مشکل ہے۔ اردو زبان کے محققین اگرچہ اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی لیکن مقام اور نوعیت کے تعین اور نتائج کے استخراج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس انداز سے اگر اردو کے متعلق نظریات کو دیکھا جائے تو وہ نمایاں طور پر چار مختلف نظریات کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

دکن میں اردو

سندھ میں اردو

پنجاب میں اردو

دہلی میں اردو

## دکن میں اردو

نصیر الدین ہاشمی اردو زبان کا سراغ دکن میں لگاتے ہیں۔ ان کا بنیادی استدلال یہ ہے کہ طلوعِ اسلام سے بہت پہلے عرب ہندوستان میں مالابار کے ساحلوں پر بہ غرضِ تجارت آتے تھے۔ تجارت کے ضمن میں ان کے تعلقات مقامی لوگوں سے یقیناً ہوتے تھے۔ روزمرہ کی گفتگو اور لین دین کے معاملات میں یقیناً انھیں زبان کا مسئلہ درپیش آتا ہوگا۔ اسی میل میلاپ اور اختلاط و ارتباط کی بنیاد پر نصیر الدین ہاشمی نے یہ نظریہ ترتیب دیا کہ اس قدیم زمانے میں جو زبان عربوں اور دکن کے مقامی لوگوں کے مابین مشترک وسیلہ اظہار قرار پائی، وہ اردو کی ابتدائی صورت ہے۔

جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ قابلِ قبول نہیں۔ ڈاکٹر غلام حسین اس نظریے کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''عربی ایک سامی النسل زبان ہے جب کہ اردو کا تعلق آریائی خاندان سے ہے۔ اس لیے دکن میں اردو کی ابتدا کا سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے۔ دکن میں اردو شمالی ہند سے خلجی اور تغلق عساکر کے ساتھ آئی اور یہاں کے مسلمان سلاطین کی سرپرستی میں اس میں شعر و ادب تخلیق ہوا۔ بہر کیف اس کا تعلق اردو کے ارتقا سے ہے، ابتدا سے نہیں۔''

اسی طرح دیکھا جائے تو جنوبی ہند (دکن) کے مقامی لوگوں کے ساتھ عربوں کے تعلقات بالکل ابتدائی اور تجارتی نوعیت کے تھے۔ عرب تاجروں نے کبھی یہاں مستقل طور پر قیام نہیں کیا۔ یہ لوگ بہ غرضِ تجارت آتے، یہاں سے کچھ سامان خریدتے اور واپس چلے جاتے۔ طلوعِ اسلام کے ساتھ یہ عرب تاجر، مالِ تجارت کی فروخت اور اشیائے ضرورت کے تبادلے کے ساتھ ساتھ تبلیغِ اسلام بھی کرنے لگے۔ اس سے تعلقات کی گہرائی تو یقیناً پیدا ہوئی مگر تعلقات استواری اور مضبوطی کے اس مقام تک نہ پہنچ سکے، جہاں ایک دوسرے کا وجود ناگزیر ہو کر یگانگت کے مضبوط رشتوں کا باعث بنتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ نزدیکی اور قرب پیدا نہ ہوسکا، جہاں زبان میں اجنبیت کم ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جانے کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ عربوں کے یہ تجارتی و مقامی تعلقات لسانی سطح پر کسی بڑے انقلاب کی بنیاد نہ بن سکے، البتہ فکری سطح پر ان کے اثرات کے نتائج سے انکار نہیں۔

## سندھ میں اردو

یہ نظریہ سید سلیمان ندوی کا ہے۔ جس کے تحت ان کا خیال ہے کہ مسلمان فاتحین جب سندھ پر حملہ آور ہوئے اور یہاں کچھ عرصے تک ان کی باقاعدہ حکومت بھی رہی، اس دور میں مقامی لوگوں سے اختلاط وارتباط کے نتیجے میں جو زبان وجود پذیر ہوئی، وہ اردو کی ابتدائی شکل تھی۔

ان کے خیال میں: "مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں، اس لیے قرین قیاس بھی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں، اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

اس میں شک نہیں کہ سندھ میں مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور تمدن و کلچر کا اثر مستقل اثرات کا حامل ہے۔ مقامی لوگوں کی زبان، لباس اور رہن سہن میں دیرپا اور واضح تغیرات سامنے آئے ہیں بلکہ عربی زبان و تہذیب کے اثرات سندھ میں آج تک دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ آج سندھی زبان میں عربی کے الفاظ کی تعداد پاکستان و ہند کی دوسری تمام زبانوں کی نسبت زیادہ ہے۔ اس کا رسم الخط بھی عربی سے بلاواسطہ طور پر متاثر ہے۔ عربی اثرات کی گہرائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک دوسری زبانوں میں جہاں دیسی زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں، وہاں سندھی میں عربی الفاظ آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سندھی میں پہاڑ کو 'جبل' اور پیاز کو 'بصل' کہنا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ اثرات زبان میں الفاظ کے دخول سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اس لیے کوئی مشترک زبان پیدا نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی اپنے اس دعویٰ کا کوئی معقول ثبوت نہیں دے سکے۔

بقول ڈاکٹر غلام حسین، "اس بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ابتدائی فاتحین عرب تھے، جن کے خاندان یہاں آباد ہو گئے۔ نویں صدی میں جب ایران میں صفاریوں کا اقتدار ہوا تو ایرانی اثرات سندھ اور ملتان پر ہوئے۔ اس عرصہ میں کچھ عربی اور فارسی الفاظ کا انجذاب مقامی زبان میں ضرور ہوا ہوگا، اس سے کسی نئی زبان کی ابتدا کا قیاس شاید درست نہ ہوگا۔"

اس دور کے بعض سیاحوں نے یہاں عربی، فارسی اور سندھی کے رواج کا ذکر ضرور کیا ہے مگر ان بیانات سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ یہاں کسی نئی مخلوط زبان کا وجود بھی تھا

البتہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سندھی اور ملتانی میں عربی اور فارسی کی آمیزش ہوئی ہوگی۔ اس آمیزش کا ہیولیٰ قیاس کرنا کہاں تک مناسب ہے، خاطر خواہ مواد کی عدم موجودگی میں اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔

## پنجاب میں اردو

حافظ محمود شیرانی نے اپنے گہرے لسانی مطالعے اور ٹھوس تحقیقی بنیادوں پر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی۔ ان کے خیال کے مطابق اردو کی ابتدا، اس زمانے میں ہوئی جب سلطان محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری ہندوستان پر بار بار حملے کر رہے تھے۔ ان حملوں کے نتیجے میں فارسی بولنے والے مسلمانوں کی مستقل حکومت پنجاب میں قائم ہوئی اور دہلی کی حکومت کے قیام سے تقریباً دو سو سال تک یہ فاتحین یہاں قیام پذیر رہے۔ اس طویل عرصے میں زبان کا بنیادی ڈھانچہ صورت پذیر ہوا۔ اس نظریے کی صداقت کے ثبوت میں شیرانی صاحب نے اس علاقے کے بہت سے شعرا کا کلام پیش کیا ہے۔ جس میں پنجابی، فارسی اور مقامی بولیوں کے اثرات سے ایک نئی زبان کی ابتدائی صورت نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس سلسلہ میں لکھتے ہیں، "سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے ساتھ ساتھ برصغیر کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ فتوحات کا یہ سلسلہ ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۶ء تک جاری رہا اور پنجاب و سندھ کے علاوہ قنوج، گجرات (سومنات) متھرا اور کالنجر تک فاتحین کے قدم پہنچے لیکن محمود غزنوی نے ان سب مفتوحہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کیا، البتہ ۱۰۲۵ء میں لاہور میں اپنا نائب مقرر کر کے پنجاب کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ نئے فاتحین میں ترک اور افغان شامل تھے۔ غزنوی عہد میں مسلمان کثیر تعداد میں پنجاب میں آباد ہوئے۔ علما اور صوفیا نے یہاں آ کر رشد و ہدایت کے مراکز قائم کیے اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتیجے میں مقامی باشندے گروہ در گروہ اسلام قبول کرنے لگے۔ اس سماجی انقلاب کا اثر یہاں کی زبان پر پڑا۔ کیونکہ فاتحین نے پنجاب میں آباد ہو کر یہاں کی زبان کو بول چال کے لیے اختیار کیا۔ اس طرح غزنوی دور میں مسلمانوں کی اپنی زبان، عربی،

فارسی اور ترکی کے ساتھ ایک ہندوی زبان کے خط و خال نمایاں ہوئے۔"

مسلمان تقریباً پونے دو سو سال تک پنجاب، جس میں موجودہ سرحدی صوبہ اور سندھ شامل تھے، حکمران رہے۔ ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک کے لشکروں کے ساتھ مسلمانوں نے دہلی کی طرف پیش قدمی کی اور چند سالوں کے بعد ہی سارے شمالی ہندوستان پر مسلمان قابض ہو گئے۔ اب لاہور کی بجائے دہلی کو دارالخلافہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تو لازماً مسلمانوں کے ساتھ یہ زبان جو اس وقت تک بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی، ان کے ساتھ ہی دہلی کی طرف سفر کر گئی۔

تاریخی اور سیاسی واقعات و شواہد کے علاوہ پروفیسر محمود خان شیرانی، اردو اور پنجابی کی لسانی شہادتوں اور مماثلتوں سے دونوں زبانوں کے قریبی روابط و تعلق کو واضح کر کے اپنے اس نظریے کی صداقت پر زور دیتے ہیں کہ اردو کا آغاز پنجاب میں ہوا۔ فرماتے ہیں: "اردو اپنی صرف و نحو میں پنجابی و ملتانی کے بہت قریب ہے۔ دونوں میں اسماء و افعال کے خاتمے میں الف آتا ہے اور دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں جمع کے جملوں میں نہ صرف جملوں کے اہم اجزا بلکہ ان کے توابعات و ملحقات پر بھی ایک باقاعدہ جاری ہے۔ دونوں زبانیں تذکیر و تانیث کے قواعد، افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں پنجابی اور اردو میں ساٹھ فی صدی سے زیادہ الفاظ مشترک ہیں۔"

مختصراً پروفیسر شیرانی کی مہیا کردہ مشابہتوں اور مماثلتوں پر نظر ڈالیں تو دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اردو اپنی ساخت اور صرفی و نحوی خصوصیات کی بنا پر پنجابی زبان سے بہت زیادہ قریب ہے اور اس سے بھی پروفیسر موصوف کے استدلال کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔

الغرض اگر ہم پروفیسر شیرانی کی تحقیق پر تنقیدی نظر ڈالیں تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ واقعی اردو اپنی ہیئت ساخت اور صرف و نحو کی خصوصیات کی بنا پر پنجابی سے قریب تر ہے۔ مثلاً،

ا۔ اردو اور پنجابی میں تذکیر و تانیث کے قواعد یکساں ہیں۔ مثلاً اکثر الفاظ جو الف پر ختم ہوں اگر ان کی تانیث کرنی مقصود ہو تو 'الف' کو 'ی' میں بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً بکرا، بکری۔ گھوڑا، گھوڑی۔ کالا، کالی وغیرہ

۲۔ مصدر کا قاعدہ بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے۔ یعنی فعل امر کے آخر میں 'نا' کے اضافے سے مصدر بنایا جاتا ہے۔

۳۔ فعل تذکیر و تانیث دونوں میں اپنے فاعل کی حالت کے مطابق آتا ہے۔ مثلاً گھوڑی آئی (اردو) کوڑی آئی (پنجابی) لڑکا آیا (اردو) منڈا آیا (پنجابی)

۴۔ فعل لازم سے فعل متعدی بنانے کے قاعدے بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہیں جیسے سیکھنا سے سکھانا (اردو)، سکھنا سے سکھانا (پنجابی) بیٹھنا سے بٹھانا (اردو) اور بہنا سے بہانا (پنجابی) اس کے علاوہ ماضی مطلق، ماضی احتمالی شکیہ، مضارع، مستقبل کے اصول، مضارع، امر کے قاعدے، معروف و مجہول، دعائیہ، ندائیہ کے اصول و ضوابط دونوں زبانوں میں یکساں ہیں۔

یاد رہے کہ "پنجاب میں اردو" کی اشاعت سے قبل مولانا محمد حسین آزاد کے پیش کردہ نظریے کو ہی قبولیت عام حاصل تھی مگر حافظ صاحب کی کتاب نے تحقیق کے تمام تر دروازے پنجاب کی سرزمین کی طرف وا کر دیے۔ خود حضرت علامہ محمد اقبال کو جب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف "دکن میں اردو" پیش کی تو انھوں نے کہا، "غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے، اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہوگی تو مورخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے"۔

پروفیسر سنیتی کمار چیٹر جی نے بھی پنجاب میں مسلمان فاتحین کے معاشرتی اور نسلی اختلاط کا ذکر کیا ہے اور ڈاکٹر زور کے نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔ ان کے خیال میں قدرتی طور پر مسلمانوں نے جو زبان ابتداً اختیار کی، وہ وہی ہوگی جو اس وقت پنجاب میں بولی جاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں پنجابی زبان خاص طور پر مشرقی پنجاب اور یو پی کے مغربی اضلاع کی بولیوں میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں اور یہ فرق آٹھ، نو سو سال پہلے تو اور بھی زیادہ کم ہوگا۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ وسطی و مشرقی پنجاب اور مغربی یو پی میں اس وقت قریباً ملتی جلتی بولی رائج ہو۔ مزید براں پروفیسر موصوف حافظ شیرانی کی اس رائے سے بھی متفق دکھائی دیتے ہیں کہ پنجاب کے لسانی اثرات کا سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔

حافظ محمود شیرانی کی تالیف "پنجاب میں اردو" کی اشاعت کے ساتھ ہی مولانا محمد حسین

آزاد کے نظریے کی تردید ہوگئی، جس میں وہ زبان کی ابتدا کے بارے میں اردو کا رشتہ برج بھاشا سے جوڑتے ہیں۔ پنجاب میں اردو کا نظریہ خاصہ مقبول رہا مگر پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی تالیف ''کیفیہ'' کے منظرِ عام پر آنے سے یہ نظریہ ذرا مشکوک سا ہوگیا۔ مگر خود پنڈت موصوف اردو کی ابتدا کے بارے میں کوئی قطعی اور حتمی نظریہ نہ دے سکے۔ یوں حافظ محمود شیرانی کے نظریے کی اہمیت زیادہ کم نہ ہوئی۔

## دہلی میں اردو

اس نظریے کے حامل محققین اگرچہ لسانیات کے اصولوں سے باخبر ہیں مگر اردو کی پیدائش کے بارے میں پنجاب کو نظر انداز کر کے دہلی اور اس کے نواح کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔ لیکن دہلی اور اس کے نواح کی مرکزیت اردو زبان کی نشو ونما اور ارتقا میں تو مانی جا سکتی ہے، ابتدا اور آغاز میں نہیں۔ البتہ ان علاقوں کو اردو کے ارتقا میں یقیناً نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ دہلی اور اس کے نواح کو اردو کا مولد و مسکن قرار دینے والوں میں ڈاکٹر مسعود حسین اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نمایاں ہیں۔

وہ اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کی ابتدا کا مسلمانوں سے یا سرزمینِ ہند میں ان کے سیاسی اقتدار کے قیام اور استحکام سے کیا تعلق ہے۔ اردو میرٹھ اور دہلی کی زبان ہے، اُس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اردو اپنے ہار سنگھار کے ساتھ دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں بولی جاتی ہے لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس زبان کا آغاز انہی اضلاع میں ہوا یا کسی اور مقام میں جہاں سے اسے دہلی اور یوپی کے مغربی اضلاع میں لایا گیا۔''

ان نظریات کے علاوہ میر امن، سرسید اور محمد حسین آزاد نے بھی کچھ نظریات اپنی تصانیف میں پیش کیے لیکن یہ نظریات محققہ طور پر حقیقت سے دور ہیں اور جن کے پیش کنندگان فقدانِ تحقیق کا شکار ہیں۔

## مجموعی جائزہ

اردو کی ابتدا کے بارے پروفیسر محمود شیرانی کا یہ استدلال بڑا وزن رکھتا ہے کہ کہ غزنوی دور میں جو ایک سو ستر سال تک حاوی ہے، ایسی بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے۔ اردو چونکہ پنجاب میں بنی اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی کے مماثل ہو یا اس کے قریبی رشتہ دار ہو۔ بہر حال قطب الدین ایبک کے فوجی اور دیگر متوطنین پنجاب سے کوئی ایسی زبان ہمراہ لے کر روانہ ہوئے جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے ہیں۔

یوں محققین کی ان آرا کے بعد یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ قدیم اردو کا آغاز جدید ہند آریائی زبانوں کے طلوع کے ساتھ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ اس زمانے میں ہو گیا، جب مسلم فاتحین مغربی ہند (موجودہ مغربی پاکستان) کے علاقوں میں آباد ہوئے اور یہاں اسلامی اثرات بڑی سرعت کے ساتھ پھیلنے لگے۔

حصہ دوم

# اُردو ادب کے ادوار

maablib.org

# اُردو ادب کے ادوار

## دکنی دور

یوں تو مسلمانوں نے دکن پر کئی حملے کیے لیکن علاؤالدین خلجی کے حملے نے یہاں کی زبان اور تہذیب و تمدن اور کلچر کو کافی حد تک متاثر کیا۔ مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے علاؤالدین خلجی نے یہاں ترک سرداروں کو حکمران بنا دیا۔ بعد میں محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیوگری کو دارالسلطنت قرار دے کر ساری آبادی کو وہاں جانے کا حکم دیا۔ جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان گھرانے وہاں آباد ہوئے۔ محمد تغلق کی سلطنت کمزور ہوئی تو دکن میں آزاد بہمنی سلطنت قائم ہوئی اور دکن، شمالی ہندوستان سے کٹ کر رہ گیا۔ بعد میں جب بہمنی سلطنت کمزور ہوئی تو کئی آزاد ریاستیں وجود میں آگئیں۔ ان میں بیجاپور کی عادل شاہی حکومت اور گولکنڈہ کی قطب شاہی حکومت شامل تھی۔ ان خودمختار ریاستوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ بہت سے علم و فضل اور شعرا و ادبا دکن پہنچے۔

آیئے پہلے بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے تحت اردو کے ارتقا کا جائزہ لیں۔

### بیجا پور کی عادل شاہی حکومت:

عادل شاہی حکومت کی بنیاد ۸۹۵ ہجری میں پڑی۔ یہاں کا پہلا حکمران یوسف عادل شاہ تھا۔ بہمنی ریاست کے زوال کے بعد یوسف شاہ نے اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ یہ حکومت دو سو

سال تک قائم رہی اور نو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔ ابتدائی صدی میں دکنی زبان کی ترقی کے لیے کچھ خاص کام نہیں ہوا اور ایرانی اثرات، شیعہ مذہب اور فارسی زبان دکنی زبان کی ترقی میں بڑی رکاوٹ بنے۔ لیکن اس کے برعکس دور عادل شاہی کی شاہی سرپرستی دوسری صدی میں اردو و ادب کی ترقی میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی اور ان کے جانشین محمد عادل شاہ نے اس سلسلے میں دکنی زبان کی جانب خصوصی توجہ دی۔ محمد عادل شاہ کے جانشین علی عادل شاہ ثانی نے دکنی کو اپنی زبان قرار دیا۔ چنانچہ اس صدی میں شاہی سرپرستی کی وجہ سے ادب میں درباری رنگ پیدا ہوا۔ اصناف سخن کی باقاعدہ تقسیم ہوئی۔ قصیدے اور غزلیں کہی گئیں اور شاعری کا ایک اعلیٰ معیار قائم ہوا۔ اس کے علاوہ صوفیا نے بھی یہاں کی زبان پر گہرے اثرات چھوڑے۔

عادل شاہی دور میں اردو کے فروغ و ترویج کے مختصر جائزے کے بعد آیئے اب اس دور کے شاعروں کا مختصر تذکرہ کریں تاکہ زبان و ادب کے ارتقا کا اندازہ ہو سکے۔

**اشرف بیابانی:** شاہ اشرف کے آباؤ اجداد کا تعلق سندھ سے تھا۔ آپ جنگلوں، بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے بیابانی مشہور ہوئے۔ ان کی تصانیف میں مثنوی "نوسرہار" نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ جس میں واقعات کربلا کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی امام حسین کی شہادت کے واقعات کو بڑے موثر اور دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ "لازم المبتدی"، "واحد باری" دو منظوم فقہی مسائل کے رسالے ہیں۔ ایک اور تصنیف "قصہ آخر الزمان" کا ذکر بھی آتا ہے۔

**شاہ میراں جی شمس العشاق:** شاہ میراں جی بڑے عالم فاضل آدمی تھے۔ بقول ڈاکٹر نذیر احمد، انہوں نے بیجاپور میں ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک صاحب علم اور صاحب ذوق ہوتے رہے۔ ان کے دو فرزندوں کے نام ملتے ہیں: ایک برہان الدین جانم اور دوسرے خواجہ عطا اللہ۔ شاہ میراں جی کو جو تصانیف ہم تک پہنچی ہیں، ان میں "خوش نامہ"، "خوش نغز"، "شہادت الحقیقت" اور "مغز مرغوب" نظم میں ہیں اور "مرغوب القلوب" نثر میں۔ ان کا موضوع تصوف ہے۔ یہ تصانیف مریدوں اور عام طالبوں کے لیے بطور ہدایت لکھی گئی ہیں۔

**شاہ برہان الدین جانم:** برہان الدین جانم شاہ میراں جی شمس العشاق کے بیٹے اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں میں عارفہ خیالات اور تصوف کے مسائل پیش کیے ہیں۔ چنانچہ یہ رسالے ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ لسانی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے اردو زبان کے ارتقا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ "ارشاد نامہ" ان کی خاصی طویل نظم ہے، جس میں تصوف کے اہم مسائل طالب اور مرشد کے مابین سوال و جواب کی شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ "حجتہ البقا"، "وصیت الہادی"، "سکھ سہیلا" اور کئی دوہے اور خیال بھی ان سے منسوب ہیں۔

**ابراہیم عادل شاہ:** ابراہیم عادل شاہ اس دور کا چھٹا حکمران تھا۔ اسے فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس کے عہد میں بیجاپور علم و ادب کا مرکز بن گیا۔ بادشاہ کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا وہ خود بھی شعر موزوں کیا کرتا تھا۔ تاریخ سے بھی دلچسپی تھی اور خوش نویسی میں بھی طاق تھے۔ ابراہیم کو موسیقی سے گہرا شغف تھا۔ جس کا واضح ثبوت اس کی کتاب "نورس" ہے۔ جس میں ابراہیم نے مختلف راگ راگنیوں کے تحت اپنے نظم کیے ہوئے گیت پیش کیے ہیں۔

**عبدل:** عبدل ابراہیم عادل شاہ کے دور کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا نام عبدالقادر یا عبدالغنی تھا۔ عبدل کی صرف ایک مثنوی "ابراہیم نامہ" ملتی ہے۔ "ابراہیم نامہ" کے سات سو سے زیادہ شعر ہیں۔ اس مثنوی میں عادل شاہ کی زندگی کے حالات قلم بند ہیں۔ اگرچہ یہ ابراہیم عادل شاہ کی مکمل سوانح عمری نہیں مگر اس میں اس کی زندگی کے اہم واقعات آگئے ہیں۔ عبدل کی اس مثنوی میں اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ اس مثنوی کے ذریعے اس دور کے رسم و رواج، آداب دربار و محفل، عمارات و زیورات، سیر و شکار وغیرہ موضوعات پر قابل قدر معلومات پیش کی گئی ہیں۔

**صنعتی بیجاپوری:** صنعتی کا نام محمد ابراہیم تھا۔ صنعتی کی دو مثنویاں ملتی ہیں۔ "قصہ تمیم انصاری" اور مثنوی "گلدستہ"۔ "قصہ تمیم انصاری" ایک صاحب حضرت تمیم انصاری سے متعلق ہے۔ جو اپنے گھر سے غائب ہو گئے اور طلسمات میں پھنس گئے اور کئی سال تک مصیبتیں جھیلتے

رہے۔ ادبی نقطہ نظر سے صنعتی کی مثنویوں میں سادگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ دوسری خوبیاں بھی ہیں۔ مثنوی "گلدستہ" عشقیہ داستان ہے۔

**ملک خوشنود:** ملک خوشنود گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا غلام تھا جب سلطان کی پھوپھی خدیجہ سلطان کی شادی محمد عادل شاہ سے ہوئی تو ملک خوشنود بھی خدیجہ سلطان کے سامان کی حفاظت کے لیے روانہ کیا گیا۔ راستے میں اس نے اس عمدگی سے کام کیا کہ خدیجہ سلطان نے اسے ایک اعلیٰ عہدے پر مامور کیا۔ ملک خوشنود نے متعدد غزلیں اور قصیدے لکھے ہیں۔ اور امیر خسرو کی فارسی مثنویوں کا اردو ترجمہ بھی کیا جن میں "یوسف زلیخا"، "بازار حسن" اور "ہشت بہشت" شامل ہیں۔

**کمال خان رستمی:** رستمی قادر الکلام شاعر تھے۔ اس نے غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ ایک ضخیم مثنوی "خاور نامہ" بھی لکھی۔ رستمی نے یہ مثنوی خدیجہ سلطان شہر بانو یعنی ملکہ عادل شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی اصل میں حسام کی فارسی مثنوی خاور نامہ کا ترجمہ ہے۔ اس مثنوی میں ایک فرضی داستان نظم کی گئی ہے۔ جس کے ہیرو حضرت علی ہیں جو کئی ملکوں کے بادشاہوں سے جنگ کرتے اور جنوں پریوں سے مقابلہ کرتے ہیں ان کا مقصد تبلیغ اسلام ہے۔ یہ مثنوی کئی اعتبار سے اہم ہے، مثلاً یہ اردو کی پہلی ضخیم رزمیہ مثنوی ہے۔ ضخیم ہونے کے باوجود اس میں تسلسل نہیں ٹوٹنے پاتا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر عادل شاہی عہد کی تہذیب و معاشرت کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ اسلوب بیان بھی سادہ اور سلیس ہے۔ یہ مثنوی چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ جسے رستمی نے ڈھائی سال کی قلیل مدت میں مکمل کیا ہے۔

**حسن شوقی:** شیخ حسن نام اور شوقی تخلص تھا۔ ان کے حالات زندگی کے متعلق ہم لاعلم ہیں۔ شوقی کی دو مثنویاں ملتی ہیں۔ "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ"۔ "فتح نامہ نظام شاہ" میں جنگ تلی کوٹہ کا حال بیان کیا ہے۔ جس میں قطب شاہی، عادل شاہی اور نظام شاہی حکومتوں نے مل کر بیجا نگر کے راجہ سے مقابلہ کیا اور اس کا خاتمہ کر کے علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ مثنوی میں اس دور کے تمدن ہندوؤں مسلمانوں کے آپس میں تعلقات بھی چیزیں واضح ہو جاتی ہیں۔ دوسری مثنوی "میزبانی نامہ" میں شوقی نے سلطان کی شہر گشت اور وزیر اعظم مصطفےٰ خان کی بیٹی کی شادی اور اس کی

مہمان نوازی کا کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ شوقی غزل گو بھی تھے۔

علی عادل شاہ ثانی شاہی: محمد عادل شاہ کے بیٹے تھے۔ ان کی پرورش خدیجہ سلطان شہر بانو کی نگرانی میں ہوئی جو خود علم و ادب کی پرستار اور شعرا کی قدر دان تھی۔ ملک خوشنود اور رستمی کی صحبت نے بچپن میں ہی اس کے ذوق سخن کو نکھارا۔ باپ کے انتقال پر ۱۰۶۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ شاہی نے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اردو کے علاوہ ہندی فارسی میں شعر کہتا تھا۔ کلیاتِ شاہی میں قصیدے، مثنویاں، غزلیں، مخمس، مثمن، رباعیات اور گیت دوہے موجود ہیں۔ شاہی کی غزلوں کا اظہار و اسلوب لب و لہجے میں ندرت اور بانکپن پایا جاتا ہے۔ اس نے تشبیہوں کو مقامی رنگ دیا اور ہندوستانی روایات اور ہندو دیو مالا کو بڑی چابک دستی سے غزل میں کھپایا ہے۔ اس سے اسکے گہرے مشاہدے وسیع مطالعے اور شاعرانہ باریک بینی اور بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ملک الشعرا نصرتی: محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص کرتے تھے۔ نصرتی نے بیجاپور کے تین بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ علی عادل شاہ کے زمانے میں وہ شہید ہوئے۔ اب تک ان کی چار کتب کا پتہ چلا ہے۔ یعنی "گلشنِ عشق"، "علی نامہ"، "تاریخ اسکندری" اور "کلیاتِ نصرتی"۔

"گلشنِ عشق"، ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں کنور منوہر اور مدمالتی کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ "علی نامہ" علی عادل شاہ کی سوانح عمری ہے، جس میں نصرتی کے قصائد بھی شامل ہیں۔ نصرتی کی دونوں مثنویاں اس کے کمال فن اور قدرتِ کلام کی بہترین شہادتیں ہیں۔ نصرتی کی تیسری مثنوی "سکندر نامہ" ہے۔ اس میں سکندر عادل شاہ کی وفات پر شیواجی اور عادل شاہی فوجوں کے درمیان لڑائی ہوئی اس کا ذکر ہے۔ لیکن اس میں "علی نامہ" اور "گلشن عشق" جیسا زور بیان اور شگفتگی نہیں۔ نصرتی صرف مثنوی نگار نہیں تھا بلکہ ایک باکمال غزل گو بھی تھا۔ اگرچہ اس کی غزل بہت کم تعداد میں میسر ہے، تاہم اس کی غزل میں بے ساختگی، سلاست اور روانی محسوس ہوتی ہے۔

سید میراں ہاشمی: ہاشمی کا نام سید میراں تھا۔ وہ علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر تھا۔ ہاشمی مادر زاد اندھا تھا۔ بادشاہ کے دربار میں اسے خاصی مقبولیت حاصل تھی۔ ہاشمی نے ایک دیوان

اور مثنوی ''یوسف زلیخا'' چھوڑے۔ اس کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی کو دکن کی عورتوں کی زبان پر عبور حاصل ہے۔ اس کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلیں بھی موجود ہیں۔ اس لیے کچھ لوگ اسے ریختی کا موجد قرار دیتے ہیں۔

سن آوے تو پردے سے نکل کر بہار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عادل شاہی دور میں نثری تصانیف کے علاوہ شاعری نے بہت ترقی کی۔ اس دور کے شعرا نے ہر صنفِ سخن مثلاً مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، رباعی، گیت اور دوہے سب میں طبع آزمائی کی۔ اس دور میں پہلی بار عشقیہ اور رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں۔ مثنوی کے علاوہ قصیدہ نگاری کا آغاز ہوا اور غزل کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس دور کی غزل میں عورت کی طرف سے اظہارِ عشق پر زور ہے۔ عشق کا تصور بھی جسم کو چھونے، لطف اندوز ہونے اور رنگ رلیاں منانے کی سطح پر ہے۔ اسی دور میں ریختی کا پہلا دیوان مرتب ہوا۔ غرض یہ کہ اس دور میں شاعری کی تمام اصنافِ سخن کو نمائندگی ملی۔ زبان کو بھی ترقی نصیب ہوئی۔ جہاں تک نثری ادب کا تعلق ہے اس کا موضوع زیادہ تر مسائلِ تصوف تک محدود ہے۔

## قطب شاہی دور

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی شاہ تھا۔ سلطان قلی شاہ بھی عادل شاہی سلطنت کے بانی یوسف خان عادل کی طرح ایران سے جان بچا کر دکن آیا اور اپنی اعلیٰ صلاحیتوں، قابلیت، وفاداری اور سخت کوشی کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کیں اور صوبہ تلنگانہ کا صوبہ دار بن گیا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد اپنی خودمختیاری کا اعلان کیا اور دکن میں ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھی جو کم و بیش ایک سو اسی برس تک قائم رہی۔

قطب شاہی سلاطین علم و ادب سے خاص لگاؤ رکھتے تھے اور اہلِ ہنر کی قدر دانی کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی سرپرستی میں مختلف علوم و فنون نے ترقی کی۔ قطب شاہی دور کو تین ادوار میں تقسیم

کیا جاتا ہے۔

ا۔ ابتدائی کوشش جو ۱۵۰۸ء سے ۱۵۸۰ء تک ہوئیں۔

۲۔ عروج کا زمانہ جو ۱۵۸۰ء سے ۱۶۷۶ء تک جاری رہا۔

۳۔ دورِ انتشار جو ۱۶۷۶ء سے شروع ہو کر ۱۶۸۷ء پر ختم ہوا۔

تیسرا دور چونکہ حکومت کمزور ہونے کی وجہ سے انتشار کا دور ہے، اس لیے اس دور میں علم وادب کے حوالے زیادہ قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔ آیئے ابتدائی دو ادوار کا جائزہ لیتے ہیں۔

**پہلا دور:** سلطنت گولکنڈہ کے ابتدائی دور کے چار بادشاہ، سلطان قلی، جمشید قلی، سبحان قلی اور ابراہیم قلی اپنی سلطنت کے استحکام میں مصروف رہے اور انتظام کی طرف زیادہ توجہ کی لیکن یہ بادشاہ بھی صاحب ذوق تھے۔ اس طرح ابراہیم کی کوششوں سے ہی گولکنڈہ میں علمی وادبی فضاء پیدا ہوئی اور عوام اردو زبان میں دلچسپی لینے لگے۔ اس دور میں فارسی شعراء کو فروغ حاصل ہوا لیکن ابراہیم کے عہد میں اردو شعراء میں ملا خیالی، ملا فیروز اور سید محمود کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

**دوسرا دور:** قطب شاہی سلطنت کا یہ دور صحیح معنوں میں علم وادب کی ترقی اور عروج کا دور ہے۔ کیونکہ ابراہیم قطب شاہ نے جس طرح اہلِ علم وفضل کی قدر دانی کی تھی، اس کی وجہ سے دور دور سے اہلِ علم وفضل آ کر دکن میں جمع ہو چکے تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کی وفات پر گولکنڈہ کو محمد قلی قطب شاہ جیسا حکمران نصیب ہوا۔ محمد قلی قطب شاہ کا دور کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا دور پرامن دور تھا۔ ایسے پرامن اور خوشحال زمانے میں جب بادشاہ خود شعر وشاعری کا دلدادہ ہو اور اس کے دربار میں ایک سے بڑھ کر ایک ہیرا موجود ہو تو ظاہر ہے کہ دوسرے میدانوں کی طرح علم وادب کے میدان میں بھی زبردست ترقی ہوئی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہمیں ملا وجہی، غواصی، احمد، ابنِ نشاطی وغیرہ جیسے بلند پایہ شاعروں اور ادیبوں کے نام نظر آتے ہیں۔

ذیل میں اس دور کے مشہور شعراء اور ادبا کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہوگا۔

**قلی قطب شاہ:** قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے پانچویں فرماں رواں تھے۔ محمد قلی قطب شاہ

اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری، وہ اردو زبان و ادب کا محسن اعظم ہے۔ انتظام سلطنت کے بعد اسے اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی تو اردو سخن ہی تھا۔ اس نے ابتدائی ایام میں اردو کی سرپرستی کی اور اسے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کا وسیلہ بنا کر ایک نئی توانائی بخشی۔ قلی قطب شاہ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن اس کی غزلیں خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ ان غزلوں میں ہندی اثرات ہونے کی وجہ سے اظہار محبت عورت کی طرف سے ہے۔ اس کی غزل میں سوز و گداز بھی ہے اور جذبات کی بے ساختگی بھی ملتی ہے۔ اس نے غزل کے موضوعات میں اضافہ کیا اور اسے محض غم جاناں تک محدود نہیں رکھا۔

تیری الفت کا میں سرمست ہور متوال ہوں پیارے
نہیں ہوتا بجز اس کے کسی مے کا اثر مجھ کو

محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ اس نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ اس کے دیوان میں نیچرل شاعری کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے ہاں ہلال عید، ترکاری، پھل، پھول، سالگرہ، رسم جلوہ، دیگر رسومات شادی بیاہ، شب معراج، عید رمضان، عید الضحیٰ، وغیرہ پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ جو کہ اس وقت کے دکن کی مکمل تصویر کشی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

**ملا وجہی:** محمد قلی قطب کے ہم عصر شعرا میں ملا وجہی سب سے بڑا شاعر ہے۔ وجہی کا سب سے بڑا کارنامہ اردو پہلی نثری کتاب "سب رس" ہے۔ جو کہ فتاحی نیشاپوری کی کہانی "حسن و دل" کا اردو ترجمہ ہے۔ "سب رس" کئی حوالوں سے بہت اہم کتاب ہے۔ اس کی عبارت مسجع و مقفی ہے۔ لیکن اردو انشائیہ نگاری کے ابتدائی خطوط ہمیں ملا وجہی کے ہاں ہمیں اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔

وجہی نے ۱۴۰۰ء میں ایک مثنوی "قطب مشتری" کے نام سے لکھی۔ اس میں اس نے بھاگ متی کے ساتھ بادشاہ کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ مگر صاف صاف نام لکھنے کی بجائے بھاگ متی کی جگہ مشتری لکھا اور اسے بنگال کی شہزادی بتایا ہے۔ قطب مشتری وجہی کے شاعرانہ کمال کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں زبان کی برجستگی اور صفائی کے علاوہ مرقع نگاری کے عمدہ نمونے بھی ملتے

ہیں۔ جن سے اس دور کی مجلسی اور تہذیبی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

**سلطان محمد قلی شاہ:** سلطان محمد "قلی قطب شاہ" کا بھتیجا اور داماد تھا جو اس کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا۔ وہ خود شاعر تھا لیکن نغمہ اور عشقیہ شاعری سے پرہیز کرتا تھا۔ اس نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ اسے علم و فضل اور تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس کی شاعری پر بھی تصوف، مذہب اور فلسفہ کا اثر نمایاں ہے۔ وہ ظل اللہ تخلص کرتا تھا۔ مگر اس کا دیوان نایاب ہے۔

**ملک الشعراء غواصی:** غواصی کو گولکنڈہ کا ملک شعرا سمجھا جاتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں وجہی کو غواصی کے شاعرانہ کمال نے حسد میں مبتلا رکھا۔ اور اسے دربار سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جس کے وجہ سے قلی قطب شاہ کے دربار میں غواصی کو اپنے کمال کی داد نہ مل سکی۔ مگر عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی غواصی نے اپنی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" میں معمولی رد و بدل کر کے اسے سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چنانچہ غواصی کو ملک الشعرا بنا دیا گیا۔ غواصی کی دوسری مثنوی "طوطی نامہ" پہلی مثنوی سے زیادہ ضخیم اور دلچسپ ہے۔ یہ دراصل فارسی کے "طوطی نامہ" کا ترجمہ ہے۔ "طوطی نامہ" کی زبان اس کی پہلی مثنوی سے زیادہ سلیس اور دلکش ہے مگر شاعرانہ خصوصیات اور نزاکتیں پہلی مثنوی میں زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ غواصی کی ایک اور مثنوی "مینا ستونتی" کچھ عرصہ قبل دریافت ہوئی ہے۔ مثنوی کے علاوہ اس کے کلام میں غزل، قصیدہ اور مرثیہ بھی ملتے ہیں۔

**سلطان عبداللہ قطب شاہ:** عبداللہ قطب شاہ گولکنڈہ کا ساتواں حکمران تھا۔ اس کی عادات و خصائل اپنے نانا قطب شاہ سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ چنانچہ اس کے عہد میں وہ تمام رنگ رلیاں اور تقاریب پھر سے جاری ہو گئیں جو سلطان محمد کے عہد میں منسوخ تھیں۔ سلطان کو شعر و سخن سے بہت زیادہ لگاؤ تھا۔ اُس نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے۔ اُس نے موسیقی کے متعلق بھی ایک کتاب لکھی۔ سلطان نے حافظ کی غزلوں کے ترجمے بھی کیے۔ عبداللہ قطب شاہ جمالیاتی اعتبار سے محمد قلی قطب شاہ کی روایت کے شاعر ہیں۔ اس کے ہاں متعلقات حسن کا ذکر کثرت سے ہے۔ اس کے اشعار میں مغل دور کے جمالیاتی طرز احساس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں

**ابن نشاطی:** شعرائے گولکنڈہ میں ابن نشاطی ایک عظیم فنکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی زندگی کے حالات معلوم نہیں۔ "پھول بن" ان کی لافانی مثنوی ہے۔ جس سے اس کے بارے میں کچھ کچھ اشارے ملتے ہیں۔ نشاطی نہ صرف شاعر تھا بلکہ انشا پرداز بھی۔ وہ درباری شاعر کی بجائے ایک عوامی فنکار تھا جو دربار سے زیادہ عوام میں مقبول تھا۔ زبان کی سادگی اور سلاست کے اعتبار سے مثنوی "پھول بن" شاعری کا اچھا نمونہ کہی جا سکتی ہے۔

**طبعی:** ڈاکٹر زور کے نزدیک طبعی، ابن نشاطی کے بعد حیدر آباد کا سب سے بڑا استادِ سخن گزرا ہے۔ ابن نشاطی کی طرح وہ بھی آزاد منش تھا۔ اس نے بھی دربار سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ طبعی نے مثنوی "بہرام و گل اندام" لکھی۔ جو دکنی اردو کے بہترین کارناموں میں سے ہے۔ زبان کی سلاست اور شستگی قابلِ داد ہے۔ اس کی یہ مثنوی نہ صرف زبان کے اعتبار سے بلکہ ادبی اعتبار سے فن کے اعلیٰ نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔ طبعی نے شاعرانہ تشبیہات و استعارات میں مقامی اور فارسی دونوں روایتوں کو ملا دیا ہے۔

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو اس عہد میں اردو زبان و ادب کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جہاں قطب شاہی حکمران اہلِ علم و ہنر کی سرپرستی کرتے تھے، وہاں ان میں سے اکثر و بیشتر شعر و شاعری کے رسیا تھے۔ ان کے دور میں قصیدہ، مثنوی، غزل کے میدان میں کافی کام ہوا۔ زبان کی ابتدائی صورت ہونے کے باوجود بہترین تخلیقات منظرِ عام پر آئیں۔

**ولی دکنی:** ولی کے خاندان، مقام پیدائش اور تاریخ وفات بھی کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض محققین کے خیال میں احمد نگر میں پیدا ہوئے۔ لیکن میر تقی میر کے نکات الشعرا کے حوالے سے جائے پیدائش اورنگ آباد اور سنہ ولادت ۱۶۶۸ء تسلیم کیا جاتا ہے۔ نام بھی نزاعی ہے لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی، ولی محمد کو اصل نام تسلیم کرتے ہیں۔

ولی کو بلاشبہ جنوبی ہند ہی نہیں بلکہ اردو کے عظیم شعرا میں شمار کیا جا سکتا ہے بلکہ عابد علی عابد نے تو ٹی ایس ایلیٹ کے معیار کے مطابق صرف ولی کو اردو شاعری میں "کلاسیک" کی مثال شمار کیا ہے۔ دکنی شعرا نے غزل کے ڈھانچے کو تو اپنایا لیکن اس کے مزاج سے پوری طرح شیر و شکر

نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان کی غزل پر ہندی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں۔ لیکن ولی نے لسانی اجتہاد سے کام لیتے ہوئے فارسی شاعری کا بغور مطالعہ کیا۔ غزل کے مزاج کو سمجھا اور فارسی غزل سے استفادہ کرتے ہوئے اردو غزل کو مستحکم بنیادوں پر استوار کیا۔ ولی نے نہ صرف مضامین کو وسعت دی بلکہ لسانی اعتبار سے بھی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

ولی کی شاعری میں زندگی سے بھرپور لب و لہجہ ملتا ہے جو ہمیں زندگی کی زرخیزی کا احساس دلاتا ہے۔ اس کا تصور حسن نشاطیہ لے سے بھرپور ہے۔ لیکن یہ نشاطیہ انداز بھی حد سے متجاوز نہیں ہوتا۔ ولی کی شاعری میں فطرت کا تمام حسن سمٹ کر آ گیا ہے۔

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں خوش آتا نہیں مجھ کو
بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

صنم مجھ دیدہ و دل میں گزر کر
ہوا ہے باغ ہے آب رواں ہے

ولی کا تصور عشق پاکیزہ ہے۔ عشق کو وہ ہادی و رہبر تصور کرتے ہیں۔ اور محبوب کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف کرتے وقت سراپا نگاری میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صوفیانہ تصورات بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔

حسن تھا عالم تجرید میں سب سوں آزاد
طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ولی کے دیوان کی بدولت ہوا۔ ان کا اثر معاصرین اور مقلدین پر موقوف نہیں بلکہ ان کے اثرات آج تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

# میرؔ و سوداؔ سے غالبؔ و مومنؔ تک

## دبستانِ دِلی و دبستانِ لکھنؤ کا جائزہ

### سلطنتِ اَوَدھ (Awadh)

دہلی کی مغلیہ سلطنت کے بعد جو نیم آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں ان میں سے ایک سلطنت اودھ بھی تھی۔

**حکمران:** اس سلطنت کا بانی دربار دہلی کا ایک ایرانی امیر سعادت خاں (۱۷۲۲ء تا ۱۷۳۹ء) تھا، جس کو مغل حکمران کی طرف سے برہان الملک کا خطاب ملا تھا۔

اودھ کی ریاست بھی سلطنت دہلی کی بالادستی تسلیم کرتی تھی اور اس کے کئی حکمران بادشاہ دہلی کے عہدیدار تھے۔ سعادت خاں نے کرنال کی جنگ میں اپنے توپ خانے کے ساتھ نادر کے مقابلے میں محمد شاہ کی مدد کی تھی۔ صفدر جنگ (۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۴ء) اور شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء) نے وزیر سلطنت کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آ گئی لیکن انگریزوں نے اپنی سیاسی مصلحت کی وجہ سے اس کا وجود ختم نہیں کیا۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں اودھ کی ریاست اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ۱۷۷۴ء میں روہیل کھنڈ کے حکمران حافظ رحمت خاں (۱۷۴۹ء تا ۱۷۷۴ء) کو انگریزوں کی مدد سے شکست دینے کے بعد روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی اودھ میں شامل ہو گیا اور ریاست کی حدود گورکھ پور سے دریائے جمنا کے کنارے تک پھیل گئیں۔

شجاع الدولہ کے بعد اودھ کی ریاست پر انگریزی دباؤ بڑھ گیا اور والیان اودھ انگریزوں کے احکا.. کے آگے بے بس ہو گئے۔ آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۹۷...ء) کے زمانے میں جونپور اور غازی پور کے انتزاع پر اور ...ت علی خاں (۱۷۹۸ء تا ۱۸۱۴ء) کے زمانے میں روہیل کھنڈ،

کانپور، الہ آباد، اعظم گڑھ اور گورکھ پور کے اضلاع پر انگریز قابض ہو گئے۔ نوابانِ اودھ اب انگریزوں کی کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہے تھے، لیکن اس حالت میں غازی الدین حیدر (۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) نے نواب کا لقب چھوڑ کر بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب وہ بادشاہ دہلی کے ماتحت نہیں رہے۔ اس کے بعد سے اودھ کے تمام حکمران بادشاہ کہلائے جانے لگے۔ آخری حکمران واجد علی شاہ (۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء) پر انگریزوں نے بدنظمی کا الزام لگا کر تخت سے الگ کر دیا اور ۱۸۵۶ء میں مملکت اودھ کو برطانوی ہند میں ضم کر لیا۔ واجد علی شاہ کی پنشن مقرر کر دی گئی اور کلکتہ میں رہنے کی اجازت دے دی، جہاں اس کا ۱۸۸۷ء میں انتقال ہو گیا۔

**لکھنؤ اور اس کا معاشرہ:** شجاع الدولہ کے زمانے تک اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔ اس کے بیٹے آصف الدولہ نے لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا اور آخر تک اس کی یہ حیثیت برقرار رہی۔ نوابانِ اودھ کے زمانے میں دارالحکومت لکھنؤ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اس دور میں اس شہر نے ایک معمولی قصبے سے بڑھ کر ایک بڑے شہر کی شکل اختیار کر لی۔ نوابوں نے شاندار عمارات بنوائیں جو محلات، باغات، مساجد، امام بارگاہوں اور مقابر پر مشتمل تھیں لیکن ان میں جامع مسجد اور قیصر باغ کے دو مقبروں کے علاوہ دوسری عمارتیں فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ نہیں تھیں۔ بہرحال ان میں سے بیشتر عمارتیں آج بھی لکھنؤ کی زینت ہیں۔ شاہانِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ کا شمار شمالی ہند میں دہلی اور آگرہ کے بعد تہذیب وشائستگی کا تیسرا بڑا مرکز بن گیا۔

طوائفوں کو پہلی مرتبہ لکھنؤ میں عزت واحترام کا مقام دیا گیا۔

**علم وادب کی سرپرستی:** اردو ادب اور شاعری کی نشوونما میں دہلی کے بعد لکھنؤ کو اہم مقام حاصل ہے۔ دہلی کے زوال، خاص طور پر نادر شاہ کے حملے کے بعد سے جب دہلی ہنگاموں کا مرکز بن گیا تو یہاں کے اہلِ فضل وکمال نے روہیل کھنڈ، لکھنؤ، مرشد آباد، حیدر آباد، ارکاٹ اور میسور کا رخ کیا۔ جہاں مقامی مسلمان حکومتوں نے ایک حد تک امن کی فضا قائم کر رکھی تھی۔ ان تمام شہروں میں لکھنؤ سب سے قریب تھا۔ نوابانِ اودھ نے بھی ادیبوں اور شعرا کی حوصلہ افزائی کی۔ اس لیے ادیبوں اور شاعروں کی بڑی تعداد نے لکھنؤ کا ہی رخ کیا، جو شاعر اس زمانے میں دہلی اور

آگرے سے لکھنؤ آئے، ان میں خانِ آرزو، سودا، مصحفی، جرأت، انشا اور میر تقی میر کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشہور شاعر آتش اگرچہ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن ان کے والد دہلی سے نقل مکانی کر کے اودھ آ گئے تھے۔

شاہانِ اودھ کے زمانے میں مرثیہ نگاری نے خاص طور پر عروج پایا اور اردو زبان کے سب سے بڑے مرثیہ نگار میر انیس اور سلامت علی دبیر اسی دور سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ ان کی زندگی کا آخری حصہ انگریزی دور میں گذرا۔

دینی تعلیم کے سلسلے میں یہ دور اس وجہ سے قابل ذکر ہے کہ ملا نظام الدین نے تعلیم کا وہ مشہور نصاب اسی زمانے میں ترتیب دیا جو آج بھی درسِ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لکھنؤ کا محلہ ''فرنگی محل'' اس دور میں برصغیر کا سب سے بڑا تعلیمی مرکز بن گیا۔ ملا نظام الدین کا انتقال ۱۷۵۸ء کے بعد ہوا۔ اودھ کا قصبہ بلگرام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس زمانے میں وہاں کی خاک سے کئی قابل ذکر علما اٹھے۔ ان میں غلام علی آزاد اور سید مرتضیٰ زبیدی قابلِ ذکر ہیں۔

## دبستانِ دلی

اورنگزیب کی وفات کے بعد اس کا بیٹا معظم تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد معظم کے بیٹے معز الدین نے اپنے بھائی کو شکست دے کر حکومت بنائی۔ معز الدین کے بھتیجے 'فرخ سیر' نے سید برادران کی مدد سے حکومت حاصل کی لیکن سید برادران نے فرخ سیر کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس طرح ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک دہلی کے تخت پر کئی بادشاہ تبدیل ہوئے۔ محمد شاہ رنگیلا کے دور میں نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کر دیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مزید کسر بھی پوری کر دی۔ دوسری طرف مرہٹے، جاٹ اور روہیلے آئے دن دہلی پر حملہ آور ہوتے اور قتلِ عام کرتے۔ اس دور میں کئی بادشاہ بدلے اور مغل سلطنت محدود ہوتے ہوتے صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے معزول کر کے رنگون بھیج دیا۔

یہ دہلی کی وہ مختصر تاریخ ہے۔ جس میں اردو شاعری پروان چڑھی۔ یہ ایک ایسا پرآشوب دور تھا جس میں ہر طرف بدنظمی، انتشار اور پستی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔ اس حالت کی وجہ سے جس قسم کی شاعری پروان چڑھی، اس میں یہی تذکرہ نمایاں ہے۔

دبستانِ دہلی کے چند شعرا کا ذکر درج ذیل ہے۔

**میر تقی میر:** میر تقی میر ۱۷۲۳ء فیض آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱۰ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ اردو شاعری کے 'خدائے سخن' کہلاتے ہیں۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری نے کہا کہ 'اردو شاعری بھی اگر اپنا خدا رکھتی تو وہ میر تقی میر ہوتے۔'

میر تقی میر کی شاعری کا اہم بنیادی عنصر غم سب سے نمایاں ہے۔ خود میر نے اپنی شاعری کے بارے میں کہا ہے:

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میر کا غم آفاقی نوعیت کا ہے، جس میں غمِ عشق سے لے کر غمِ دنیا کا احوال موجود ہے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا، بڑی صداقت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی شاعری اپنے تجربات اور احساسات کا صحیح اور سچا اظہار ہے۔ ان کے اشعار جو بھی پڑھتا ہے، اس کے دل میں اُتر جاتے ہیں:

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

میر کی شاعری ہندی اور ایرانی تہذیب کی آمیزش کی بہترین مثال ہے۔ ان کے ہاں فارسی تراکیب کے ساتھ ساتھ ہندی کا ترنم اور موسیقیت بھی ملتی ہے:

اب تو جاتے ہیں بے کدے سے میر
پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرزا محمد رفیع سودا: سودا، میر کے ہم عصر تھے۔ ان کا شمار اردو زبان کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں غزل، قصیدہ، مثنوی، مخمس، ہجو، رباعیاں، قطعے، ترجیع بند، واسوخت، سلام، مرثیے غرضیکہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ان کی شہرت بحیثیت قصیدہ گو اور ہجو گو کے زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں کی تعداد نسبتاً کم ہے، لیکن غزل میں ان کے مقام اور مرتبہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بقول خلیق انجم، "سودا کے ہاں زور بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پرواز تخیل، جدت بیان، قدرت اظہار، نشاط انگیزی اور جو جوش و خروش ملتا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔"

لیکن یہ بات یاد رہے کہ سودا کی غزلوں میں خلوص اور جذبات کی سادگی، بے ساختگی اور درد و سوز بھی ہے۔ جو میر کی غزل کا طرۂ امتیاز ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس حال میں دیکھا

خواجہ میر درد: میر درد ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ایک صوفی باپ کے بیٹے تھے۔ انھوں نے تصوف کو صرف روایت سے مجبور ہو کر نہیں اپنایا بلکہ وہ خود ایک باعمل صوفی تھے۔ ان کے مزاج میں اعتدال، توازن، حلم، تحمل اور بردباری کی صفات موجود تھیں۔ اس لیے جہاں جاتے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قناعت اور خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر

بھری ہوئی تھی۔ ان کی انھی صفات کا عکس ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ بقول عظمت اللہ
"خواجہ میر درد اردو ادبیات میں صوفیانہ شاعری کے باوا آدم تھے۔"

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشہ ظہور یہ تری ترنگ تھی

**ابراہیم ذوق:** ذوق کو بعض نقادوں نے سودا کے مشابہ قرار دیا ہے ایک تو اس لیے ہجو گوئی کے باوجود دونوں کا کوئی مخصوص طرزِ احساس نہیں اور دوسرے قصیدہ کو بھی پایہ کمال تک پہنچایا۔ بعض ناقدین کے بقول، ان کی غزل میں جذبے کا فقدان نظر آتا ہے، اس لیے کہ انھوں نے محض الفاظ کے ذریعے شاعری کی۔ انھوں نے فکر اور جذبہ کی کمی کو محاورات کے ذریعے پوری کرنے کی کوشش کی۔ بعض اشعار دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ صرف محاورہ بندی کے لیے لکھے گئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی واردات بھی ہیں اور تصوف اور اخلاقی پند بھی لیکن یہ سب روایتی محسوس ہوتے ہیں۔

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے

مرزا اسد اللہ خان غالب: غالب کی شاعری ہر دور میں نہ صرف زندہ رہی بلکہ جدید بھی رہی۔ ان کے ہاں ہمیں جنس کا ایک صحت مندانہ رویہ ملتا ہے۔ انھیں مسلسل پریشانیوں اور محرومیوں نے نہ صرف زندگی سے پیار کرنا سکھایا بلکہ انھوں نے غم کو ایک حقیقت کے روپ میں قبول کیا۔ ان کے نزدیک غم کے وجود کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی تلخی اور چبھن میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

غالب کی شاعری اس کے فلسفیانہ اور جدید ذہن کی غمازی کرتا ہے، جو کہ نئی تہذیب اور پرانی تہذیب کی آویزش اور کشمکش سے وجود میں آئی ہے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مومن خان مومن: مومن تمام عمر غزل کے پابند رہے اور غزل میں کم سے کم الفاظ میں بڑے سے بڑے خیال ابلاغ اور شدید سے شدید جذبہ کی عکاسی کی کوشش کی۔ اسی لیے جذبہ عشق سے وابستہ تہ در تہ کیفیات کے اظہار میں کمال پیدا کیا۔ چنانچہ انھوں نے دہلی کی خالص اردو میں صاف ستھری غزل تخلیق کی۔ لکھنوی شعرا کے برعکس انھوں نے جنس نگاری کو فحش اور ابتذال سے بچا کر صحت مند حدود میں رہنے دیا۔ ان کی معاملہ بندی لکھنوی شعرا سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں ایک جدید تصور عشق ملتا ہے۔ مومن کا عاشق واضح طور پر ہرجائی ہے۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

نقادوں نے ان کی شاعری کی اہم خصوصیت، نکتہ آفرینی کو بھی قرار دیا ہے:

تا نہ خلل پڑے کہیں آپ کے خواب ناز میں
ہم نہیں چاہتے کی اپنی شب دراز میں

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

## خصوصیات

سیاسی اور معاشرتی حالات کی بدولت دبستانِ دلی میں جس رنگ شاعری کا رواج ہوا، اس کی خصوصیات درج ذیل ہیں:

**زبان میں فارسیت:** دبستان دہلی کے شعرا کے ہاں فارسیت کا بہت غلبہ تھا کیونکہ شعرائے دہلی فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اور ان پر فارسی شعرا کا گہرا اثر تھا۔ ایران سے جو شعرا آتے تھے، ان میں سے اکثر یہاں ہی رہ جاتے تھے۔ چنانچہ، خسرو، حسن، عرفی، نظیری، طالب، صائب اور بیدل وغیرہ مختلف ادوار میں یہاں رہے۔ اس کے علاوہ فارسی یہاں شعرا کی زبان تھی۔ نیز یہاں کے شعرا، اردو اور فارسی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی اسالیب وموضوعات وغیرہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بہت سے شعرا نے فارسی شعرا سعدی، وحافظ کا ترجمہ کیا۔ اور خزانہ اردو کو مالا مال کیا۔ اس طرح دبستانِ دہلی کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ ہے۔

**جذبات عشق کا اظہار:** دبستان دہلی کے شعرا کے ہاں جذبات واحساسات کے اظہار زیادہ زور ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق کے جذبے کو اولیت دی۔ بقول ڈاکٹر نور الحسن ؛شعرائے دہلی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کا اسلوب بیان اور طرز ادا خوب تر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات واحساس کا اظہار ہو جائے۔' اس لے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے۔ دہلی کے کچھ شعرا عشقِ مجازی سے گزر کر عشقِ حقیقی سے سرشار ہوئے۔ ان لوگوں نے رب سے لو لگائی اور فیضانِ عشق کی بدولت ان میں ایسی بصیرت پیدا ہوئی کہ وہ تمام بنی نوعِ انسان سے محبت کرنے لگے۔ جب کہ کچھ لوگ عشقِ مجازی کی منزل

رک گئے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں محبت کا سوز اور تڑپ موجود ہے۔ جبکہ کچھ لوگ نفس پر قابو نہ پا سکے اور وہ ابولہوسی میں مبتلا ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ دہلی کی شاعری میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں۔ مثلاً درد جیسے شاعروں نے صوفی شاعری کی اور عشقِ حقیقی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

قاصد نہیں یہ کام ترا ، اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہر ِنیم روز
آپ ہی ہو نظارہ ،سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

**عشقِ مجازی:** عشق کا دوسرا انداز جو دہلی میں بہت مقبول ہوا، اس میں عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ عشقِ مجازی کے جذبات بھی شامل ہو گئے۔ یہ رنگ میر تقی میر نے بہت خوبی سے نبھایا۔ ان کے جذبہ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی، جس نے ان کی شاعری کو حیاتِ جاوداں عطا کی۔ عشق کا یہ تیکھا انداز دبستانِ دہلی سے مخصوص ہے۔ عشقِ مجازی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ جن میں دہلی کے تمام شعرا نے بڑی خوب صورتی سے ان جذبات کو شاعری کا روپ دیا ہے:

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

لوگ کہتے ہیں عاشقی جس کو
میں جو دیکھا بڑی مصیبت ہے

پھر کے جو وہ شوخ نظر کر گیا
تیرے کچھ دل میں گزر کر گیا

**حزن و یاس:** دبستانِ دہلی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت رنج و الم اور حزن و

یاس کا بیان ہے۔ دبستانِ دہلی کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ یہاں کی شاعری میں یاس و نا امیدی کے جذبات بہ کثرت موجود ہیں۔ شاعر خواہ کسی موضوع پر بات کرے، رنج و الم کا ذکر ضرور آ جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سارے دور میں کسی کو اطمینان و سکون نصیب نہ تھا۔ زندگی ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف نفسا نفسی کا عالم تھا۔ کسی شے کو ثبات نہ تھا۔ ان حالات کا شاعری پر بھی گہرا عکس نظر آتا ہے۔ خارج میں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی اور تباہی و بربادی کے تاریک سائے شاعری میں بھی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ فنا کا احساس بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ اجڑے ہوئے شہر، لٹے ہوئے نگر اور ویران گزرگاہیں جا بجا موجود ہیں۔ خصوصاً میر و سودا کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت شدت سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ چنانچہ حزن و یاس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ گل کی کھلی تو موسم تھا خزاں کا

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

اس حزن و یاس کی فضا کے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ: "ظاہر ہے دہلی کی شاعری یک سر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حرماں و مجبوری و ناکامی سے ہے۔"

**تصوف:** وارداتِ قلبی کے اظہار کے بعد دبستان دہلی کے شعرا کا دوسرا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ ابتدا میں اردو شاعری پر فارسی شاعری کی شعری روایت کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے، جس کی وجہ سے اردو شعر نے غیر شعوری طور پر فارسی شاعری کے اسالیب، سانچے، اور موضوعات قبول کر لیے۔ دوسری طرف اس موضوع کو اس لیے بھی مقبولیت ملی کہ کہ تصوف میں بھی قناعت، صبر و توکل اور نفی ذات کے نظریات نے زیادہ زور پکڑا کیونکہ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے، جن کی بنا پر لوگ ترک دنیا کی طرف مائل ہورہے تھے۔ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است'۔ ان میں کچھ تو صوفی شعرا تھے لیکن زیادہ تر شعرا نے محض رسمی طور پر تصوف کے مضامین کو نظم کیا۔ چنانچہ ذوقؔ اور غالبؔ کے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تصوف کے مضامین نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تصورات و افکار تھے جو ہندوستان کی فضا میں رچے بسے ہوئے تھے۔ جن کی بدولت انھوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یاں
ہر سنگ راہ گزر کا، دکاں شیشہ گر کا ہے

ہے جلوہ گاہ تیرا، کیا غیب کیا شہادت
یاں بھی شہود تیرا ، واں بھی شہود تیرا

سرسری تم جہاں سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

راز پوشیدہ پوچھے کس سے
بے خبر ہے، جو باخبر ہے

رمزیت اور اشاریت: تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوئی چنانچہ بقول ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی: "دہلی میں تصوف کی تعلیم اور درویشی کی روایت نے خیالات میں بلندی اور گہرائی پیدا کی اور اسلوب میں متانت و سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ تصوف کی روایات نے شاعری کو ایک اخلاقی لب و لہجہ دیا اور ابتذال سے دور رکھا۔"

مسائلِ تصوف نے اردو غزل کو رمز و کنایہ کی زبان دی، پیرِ مغاں، گل، بلبل، چمن، شمع، پروانہ، مے کدہ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں داخل ہوئیں۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس دے کر درباروں سے الگ رکھا۔ مزاجوں میں خودداری اور بے نیازی پیدا کی۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں جو رمزیت اور اشاریت آئی اس سے شعرا نے بہت فائدہ اٹھایا اور چند لفظوں میں معنی کی دنیائیں آباد کیں۔

ذیل کے اشعار دیکھیے کہ پردوں میں کتنے جہانِ معنی آباد دکھائی دیتے ہیں:

ساقی ہے اک تبسمِ گل، فرصتِ بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

وہ بادہ و شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

داخلیت: دبستانِ دہلی کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو داخلیت ہے۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر

یہ ہر شے دنیا کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اُسے بھی شدید داخلیت میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ یہ داخلیت دہلی کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ شعرائے دہلی کے ہاں خارجیت بالکل نہیں ہے۔ خارجیت بھی ہے۔ لیکن داخلیت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعرائے دہلی نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

**واقعیت و صداقت:** دبستانِ دہلی کی ایک خصوصیت واقعیت و صداقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعرا کے ہاں مبالغہ وغیرہ کم ہے۔ ان شعرا نے مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیا۔ اگرچہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برا نہیں ہے لیکن جس بھی کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اُسے مناسب و موزوں نہیں سمجھا جاتا۔ اسی طرح حد سے زیادہ مبالغہ شاعری کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ شعرا دہلی کے ہاں اعتدال پایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صداقت کے اظہار کے لیے پُر تکلف زبان کو بھی موزوں سمجھا جاتا ہے۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

سادگی: شعرائے دہلی کے ہاں زبان میں بھی سادگی، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شعرائے دہلی نے جس طرح مضامین میں واقعیت، صداقت کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی طرح زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ اگرچہ ان شعرا نے صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ صنعت برائے صنعت کے لیے نہیں ہے۔ اس کے بجائے ان شعرا نے معنوی حسن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ

اختصار: شعرائے دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و روانی کا عنصر نمایاں ہے، وہاں اختصار بھی ہے۔ اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔ اور غزل کی شاعری، اختصار کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں کنایوں میں کی جاتی ہے۔ اس لیے ان شعرا کے ہاں اختصار ملتا ہے۔ نیز غزل کا مخصوص ایمائی رنگ بھی موجود ہے۔ یہاں کے شعرا اپنے دلی جذبات و احساسات کو جوں کا توں بڑی فن کاری سے پردے ہی پردے میں پیش کر دیتے ہیں۔ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن آزاد لکھتے ہیں کہ: ”ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اس واسطے اشعار صاف اور بے تکلف ہیں۔“

ہم نشیں ذکرِ یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

بے وفائی پہ اس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

## مجموعی جائزہ

'دہلویت' کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں کہ: "دہلویت کا ایک خاص افتادِ ذہنی یا مزاجِ شعری کا نام نہیں ہے جس کا اظہار مخصوص تمدن و شہری اثرات کی وجہ سے ہوا۔ دہلی کا شاعر غمِ روزگار کا ستایا ہوا غمِ عشق کا مارا ہوا ہے۔ اسی لیے اس کے کلام میں دونوں کی کسک اور کھٹک پائی جاتی ہے۔ سیاسی حالات نے اسے قنوطی بنایا، تصوف نے اس میں روحانیت پیدا کی اور اس کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی نصب العین اور تصور عطا کیا۔ اسی نے اس کی آنکھیں اندر کی طرف کھولیں۔"

# دبستانِ لکھنؤ

"لکھنویت" سے مراد شعروادب میں وہ رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا۔ اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ قدیم اردو شاعری اور دہلوی شاعری سے مختلف ہے۔ جب لکھنؤ مرجع اہلِ دانش و حکمت بنا تو اس سے پہلے علم وادب کے دو بڑے مرکز شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اور وہ دکن اور دہلی تھے۔ لیکن جب دہلی کا سہاگ لٹا۔ دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے اہلِ علم فضل نے دہلی کی گلیوں کو چھوڑنا شروع کیا جس کی وجہ سے فیض آباد اور لکھنؤ میں علم وادب کی محفلوں نے فروغ پایا۔

## پس منظر

سال ۱۷۰۷ء ،اورنگزیب عالمگیر کی موت کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اُس کے جانشین اپنے تخت کے لیے خود لڑنے لگے۔ ان نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مرکز مزید کمزور ہوا۔ اور باقی کسر مرہٹوں، جاٹوں اور نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کردی۔

سال ۱۷۲۲ء میں بادشاہ دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا۔ مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جلد ہی سعادت علی خان نے خودمختاری حاصل کرلی۔ اور اودھ کی خوشحالی کے لیے بھرپور جدوجہد کی، جس کی بنا پر اودھ میں مال ودولت کی فروانی ہوگئی۔

صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی آمدنی میں مزید اضافہ کیا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کوششیں کیں۔ آصف الدولہ نے مزید اس کام کو آگے بڑھایا۔ لیکن دوسری طرف دہلی میں حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ امن وسکون ختم ہوگیا۔ تو وہاں کے ادبا وشعرا نے دہلی چھوڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور بہت سے شاعر لکھنؤ میں جاکر آباد ہوئے۔ جن میں میر تقی میر بھی شامل تھے۔

دولت کی فروانی، امن وامان اور سلطنت کے استحکام کی وجہ سے اودھ کے حکمران عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کے دلدادہ ہوگئے۔ شجاع الدولہ کو عورتوں سے خصوصی رغبت تھی، جس کی بنا پر

اس نے محل میں بے شمار عورتوں کو داخل کیا۔ حکمرانوں کی پیروی امرا نے بھی کی اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بازاری عورتیں ہر گلی کوچے میں پھیل گئیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر اور نصیر الدین حیدر نے آباؤ اجداد کی پیروی جاری رکھی اور واجد علی شاہ نے تو اس میدان میں سب کو مات دے دی۔

سلاطین کی عیش پسندی اور پست مذاق نے طوائف کو معاشرے کا اہم جز بنا دیا۔ طوائفوں کے کوٹھے تہذیب و معاشرت کے نمونے قرار پائے، جہاں بچوں کو شائستگی اور آداب محفل سکھانے کے لیے بھیجا جانے لگا۔

## شعر و ادب پر اثرات

عیش و نشاط، امن و امان اور شان و شوکت کے اس ماحول میں فنون نے بہت ترقی کی۔ راگ رنگ اور رقص و سرور کے علاوہ شعر و شاعری کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار پر اہلِ علم و فن اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونا شروع ہو گئے۔ یوں شاعری کا مرکز دہلی کے بجائے لکھنؤ میں قائم ہوا۔ دربار کی سرپرستی نے شاعری کا ایک عام ماحول پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا چرچا اتنا پھیلا کہ جا بجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا، روسا، اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ ابتدا میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے زبان کا اثر نمایاں رہا لیکن، آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشا کے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب و لہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اور یوں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی، جس نے اردو ادب کی تاریخ میں "دبستانِ لکھنؤ" کے نام سے ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کر لی۔

## نمائندہ شعرا

**شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی: (۱۷۵۱ء تا ۱۸۲۵ء)** مصحفی، دہلی سے ہجرت کر کے لکھنؤ آئے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شعری مزاج دہلی میں صورت پذیر

ہوا، لیکن لکھنؤ کے ماحول، دربارداری کے تقاضوں اور سب سے بڑھ کر انشا سے مقابلوں نے انھیں لکھنوی طرز اپنانے پر مجبور کیا۔ ان کا منتخب کلام کسی بھی بڑے شاعر سے کم نہیں۔ اگر جذبات کی ترجمانی میں میر تک پہنچ جاتے ہیں تو جرأت اور انشا کے مخصوص میدان میں بھی پیچھے نہیں رہتے۔ یوں دہلویت اور لکھنویت کے امتزاج نے شاعری میں شیرینی، رنگینی پیدا کردی ہے۔ ایک طرف جنسیت کا صحت مندانہ شعور ہے تو دوسری طرف تصوف اور اخلاقی مضامین بھی مل جاتے ہیں۔

جمنا میں کل نہا کر جب اُس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

تیرے کوچے میں اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

**سید انشا اللہ خان انشا**: (۱۷۵۶ء تا ۱۸۱۷ء) انشا کے والدین دہلی سے مرشد آباد گئے، جہاں انشا کی ولادت ہوئی۔ انشا کی ذہانت اور جدت پسندی انھیں اپنے ہم عصروں میں منفرد نہیں کرتی بلکہ تاریخ ادب میں بھی ممتاز مقام دلاتی ہے۔ غزل، ریختی، قصیدہ، اردو میں بے نقط دیوان "رانی کیتکی کی کہانی" جس میں عربی، فارسی کا ایک لفظ نہ آنے دیا۔ یہی نہیں انشا پہلے ہندوستانی ہیں، جنھوں نے "دریائے لطافت" کے نام سے زبان وبیان کے قواعد پر روشنی ڈالی۔

انشا نے غزل میں الفاظ کے متنوع استعمال سے تازگی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ تاہم بعض اوقات محض قافیہ پیمائی اور ابتذال کا احساس ہوتا ہے۔ انشا کی غزل کا عاشق لکھنوی تمدن کا نمائندہ وہ بانکا ہے، جس نے بعد ازاں روایتی حیثیت اختیار کرلی۔ انھوں نے غزل میں مزاح کی ایک نئی بنیاد ڈالی۔ زبان میں دہلی کی گھلاوٹ برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

گر نازنیں کہے کا برا مانتے ہیں آپ
میری طرف دیکھیے میں نازنیں سہی

لے کے اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

**شیخ قلندر بخش جرأت:** (۱۷۴۹ء تا ۱۸۱۰ء)، جرأت، دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کا مخصوص رنگ معاملہ بندی ہے۔ جو دبستانِ دہلی کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ روایت ہے کہ شریف زادیوں سے آزادانہ میل ملاپ اور زنان خانوں میں بے جھجک جانے کے لیے خود کو اندھا مشہور کردیا۔ بہرحال نابینا ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔

ان کے ہاں محبوب کی جو تصویر ابھرتی ہے، وہ جیتی جاگتی اور ایسی چلبلی عورت کی تصویر ہے جو جنسیت کے بوجھ سے جلد جھک جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جرأت کی غزل کی عورت خود لکھنؤ ہی کی عورت ہے۔ زبان میں سادگی ہے، اس لیے جنس کا بیان واضح اور دوٹوک قسم کا ہے۔ شاید اسی لیے حسن عسکری انہیں 'مزے دار شاعر' سمجھتے ہیں۔

کل وقت راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

کیا جانیے کم بخت نے کیا مجھ پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

**حیدر علی آتش:** (۱۷۷۸ء تا ۱۸۴۶ء)، آتش، فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ آتش نے نہایت سادہ زندگی بسر کی۔ طبیعت میں قناعت اور استغناء کا مادہ تھا۔ انھوں نے کسی دربار سے تعلق پیدا نہ کیا اور نہ ہی کسی کی مدح میں کوئی قصیدہ کہا۔

آتش کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی مگر ایک دہلوی استاد مصحفی کے زیرِ سایہ، اس لیے

دہلی اور لکھنو نے دبستانوں کی خصوصیت کا امتزاج پیدا ہو گیا۔ آتش، ناسخ کے مد مقابل تھے۔ ناقدین نے ناسخ پر ان کو فوقیت دیتے ہوئے، لکھنو دبستان کا نمائندہ شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں روانی، موسیقیت کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ محاورات ایسے برمحل استعمال ہوتے ہیں کہ شاعری مرصع سازی معلوم ہوتی ہے۔ آتش کا نظریہ تھا:

بندشِ الفاظ جڑنے میں نگوں سے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے کلام کی اہم خصوصیات میں نشاطیہ انداز، صفائی اور محاورات کا بہترین استعمال ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر کیفیت و مردانگی و خودداری کے جذبات کو قلم بند کیا۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

صوفیوں کو وجد میں لاتا ہے نغمہ ساز کا
شبہ ہو جاتا ہے پردے سے تیری آواز کا

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار رہ میں ہیں

**شیخ امام بخش ناسخ:** (۱۷۷۲ء تا ۱۸۸۳ء) ناسخ کی شاعری میں نہ تو جذبات احساسات ہیں اور نہ ہی ان کی پیدا کردہ سادگی ملتی ہے۔ انھوں نے مشکل زمینوں، اثقل قوافی طویل ردیفوں کے بل پر شاعری ہی نہ کی بلکہ استادی بھی تسلیم کرائی۔ آج ان کی اہمیت، زبان صفائی پیدا کرنے اور متروکات کی باقاعدہ مہم چلانے کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے زبان و بیان قوانین کی خود پیروی ہی نہ کی بلکہ اپنے شاگردوں سے ان کی پابندی کرائی۔

یوں اردو غزل کی زبان کو جھاڑ جھنکار سے پاک صاف کرنے والوں میں انھیں مستقل اہمیت حاصل ہے۔ لیکن صرف الفاظ کی بازی گری شاعری نہیں ہوتی۔ ان کے ہاں جذبے کا فقدان ہے۔

ہو گئے دفن ہزاروں ہی گل اندام اس میں
اس لیے خاک سے ہوتے ہیں گلستاں پیدا

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے کوئی
دل ہی دل میں ہم اسے یاد کیا کرتے ہیں

## خصوصیات

اکثر و بیشتر نقادوں نے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دلی کے مقابلے میں لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت کا عنصر نمایاں ہے۔ وارداتِ قلبی اور جذبات و احساسات کی ترجمانی اور بیان کے بجائے شعرائے لکھنؤ کا زیادہ زور محبوب کے لوازم ظاہری اور متعلقات خارجی کے بیان پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ لکھنوی شاعری کا دوسرا اہم عنصر نسائیت ہے۔ اس کے علاوہ معاملہ بندی، رعائیتِ لفظی، صنعت گری اور تکلفات پر زیادہ زور ہے۔

ذیل میں ہم اس کا تفصیل سے جائزہ لیں گے۔

**خارجیت اور بیروں بینی:** دلی کی شاعری کے مقابلے میں لکھنؤ کی شاعری فکر اور فلسفے سے بالکل خالی ہے۔ نتیجتاً اس میں گہرائی مفقود ہے۔ اور ظاہرداری پر زور ہے۔ دروں بینی موجود نہیں۔ سوز و گداز کی شدید کمی ہے۔ خارجیت اور بیروں بینی کے مختلف مظاہر البتہ نمایاں ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں وارداتِ قلبی کے بجائے سراپا نگاری پر زور ہے۔ ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے، سید وقار عظیم لکھتے ہیں، "لکھنویت، تکلف اور تصنع کا دوسرا نام ہے۔ جہاں شاعر محسوسات اور واردات کی سچی دنیا کو چھوڑ کر خیال کی بنی ہوئی رنگین فکر کی پیدا کی ہوئی پُر پیچ راہوں پر چل کر خوش ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ لکھنؤ کی ساری زندگی میں ظاہر پر اس قدر زور تھا

کہ شعرا کو دروں بینی کی مہلت ہی نہیں ملی۔ ان کی نظروں کے سامنے اتنے مناظر تھے کہ ان کے دیکھنے سے انہیں فرصت ہی نہیں ملی تھی۔"

ایسے میں دل کی کھڑکی کھول کر میر کی طرح اپنی ذات کے اندر کون جھانکتا۔ جب کہ انھیں عیش وعشرت اور آرائش وزیبائش کی محفلوں سے فرصت نہیں تھی۔

دیکھی شب وصل ناف اس کی
روشن ہوئی چشم آرزو کی

کتنا شفاف ہے تمہارا پیٹ
صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

بوسہ لیتی ہے تیرے پالے کی مچھلی اے صنم
ہے ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا

مضمون آفرینی: دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی دوسری نمایاں خصوصیت مضمون آفرینی ہے۔ مضمون آفرینی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر روایتی مضامین میں سے نئے مبالغہ آمیز اور عجیب وغریب پہلو تلاش کر لیتا ہے۔ ایسے مضامین کی بنیاد جذبے کے بجائے تخیل یا دابے پر ہوتی ہے۔ شعرائے لکھنؤ نے اس میدان میں بھی اپنی مہارت اور کمال دکھانے کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔

گل برگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

چشم بددور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف
سبزہ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

اس نے پونچھا پسینہ روئے عالم تاب کا
بن گیا رومال کونہ چادر مہتاب کا

**معاملہ بندی:** سراپا نگاری اور مضمون آفرینی کے علاوہ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کی ایک اور خصوصیت، جس کی نشان دہی نقادوں نے کی ہے، وہ معاملہ بندی ہے۔ چونکہ دلی کی تباہی کے وقت لکھنؤ پُر امن تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ لوگ خوش حال اور فارغ البال تھے۔ بادشاہِ وقت، امرا، وزرا، اور عوام الناس تک سب عیش و عشرت میں مبتلا تھے۔ خصوصاً طوائف کو اس ماحول میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ ماحول کے اثرات شاعری پر بھی پڑے، جس کی وجہ سے بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: ''جذبات کی پاکیزگی اور بیان کی متانت جو دہلوی شاعری کا امتیازی نشان تھی، یہاں عنقا ہوگئی۔'' اس کی جگہ ایک نئے فن نے لے لی، جس کا نام معاملہ بندی ہے۔ جس میں عاشق اور معشوق کے درمیان پیش آنے والے واقعات کو پردۂ دروں کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ایسے اشعار خال خال دہلوی شعر کے ہاں بھی موجود ہیں اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس فن میں جرأت پیش پیش تھے، جو دلی سے آئے تھے۔ لیکن لکھنؤ کا ماحول ان کو بہت راس آیا۔ چنانچہ ان کے ساتھ لکھنؤ کے دیگر شعرا نے جی بھر کر اپنے سفلی جذبات کو نظم کیا۔

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی، رات کے وقت

منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق
مس کرنے سے قرآں کی فضیلت نہیں جاتی

تلخ بادام کا منہ میں میرے آتا ہے مزہ
چشم کا بوسہ جو وہ ہو کے خفا دیتا ہے

**رعایتِ لفظی:** دبستانِ لکھنؤ کی ایک اور خصوصیت، رعایتِ لفظی بتائی جاتی ہے۔ اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا لکھتے ہیں، ''لکھنؤ کا معاشرہ خوش مزاج، مجلس آرا، اور فارغ البال لوگوں کا معاشرہ تھا۔ مجلسی زندگی کی جان لفظی رعایتیں ہوتی ہیں۔ مجلسوں میں مقبول وہی لوگ ہوتے ہیں، جنھیں زبان پر پوری قدرت ہو اور لفظ کا لفظ سے تعلق، اور لفظ کا معنی سے رشتہ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ لفظی رعایتیں محفل میں تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور طنز کو گوارا بناتی ہیں۔''

لکھنؤ میں لفظی رعایتوں کا از حد شوق تھا۔ خواص و عوام دونوں اس کے بہت شائق تھے۔ روسا اور امرا، تک بندیاں کرنے والوں کو باقاعدہ ملازم رکھا کرتے تھے۔ ان ہی اسباب کی بنا پر لکھنوی شاعری میں رعایتِ لفظی کی بہتات ہے اور لفظی رعایتیں اکثر مفہوم پر غالب آجاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات محض لفظی رعایت کو منظوم کرنے کے لیے شعر کہا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر:

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں
لالہ کا پھول رکھنا، امانت کی گور پر

غسل کر لے یہیں دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار ترے بازو سے

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

**طویل غزلیں:** لکھنوی شاعری کی ایک اور نمایاں بات، طویل غزلیں ہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا، جرأت و مصحفی نے کی، جو دلی دبستان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ جا بسے تھے۔ لیکن لکھنوی شعرا نے اس کو زیادہ پھیلایا اور بڑھایا اور اکثر لکھنوی شعرا کے ہاں طویل غزلیں بلکہ دو غزلہ، اور سہ غزلہ کے نمونے ملتے ہیں۔ اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ لکھنؤ کے اس دور میں پُر گوئی اور بدیہہ گوئی کو فن قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز لوگ قافیہ پیائی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔

اس لیے طویل غزلیں بھی لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ درجنوں اشعار پر مشتمل غزلیں تو اکثر ملتی ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا، "بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طویل غزلیں بھی لکھی جاتی تھیں۔"

**قافیہ پیمائی:** طویل غزل سے غزل کو فائدے کے بجائے یہ نقصان ہوا کہ بھرتی کے اشعار غزل میں کثرت سے شامل ہونے لگے۔ شعر نے زور کلام دکھانے کے لیے لمبی ردیفیں اختیار کرنی شروع کر دیں، جس سے اردو غزل میں غیر مستعمل قافیوں اور بے میل ردیفوں کا رواج شروع ہوا۔ معمولی قافیوں اور ردیفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس سے قافیہ پیمائی کا رواج شروع ہوا۔ ذیل میں بے میل ردیفوں سے قافیوں کی چند مثالیں درج ہیں:

انتہائی لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کر کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

فوج لڑکوں کی جڑے کیوں نہ تڑا تڑ پتھر
ایسے خبطی کو جو کھائے ہے کڑا کڑ پتھر

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہی کہ لگے تڑ سے جیسے زاغ کو چوٹ

بات طویل غزلوں اور، بے میل ردیفوں اور قافیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعرائے لکھنو نے اپنی قادر الکلامی اور استادی کا ثبوت دینے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی۔

**پیچ دار تشبیہ اور استعارے کا استعمال:** اگرچہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال ہر شاعر کرتا ہے، لیکن یہ چیز اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب حدِ اعتدال کے اندر ہو۔ شعرائے دلی کے ہاں بھی اس کا استعمال ہوا، لیکن لکھنو والوں نے اپنی رنگین مزاجی کی بدولت تشبیہوں کا خوب استعمال کیا، اور ان میں بہت اضافہ کیا۔ محسن کاکوروی، میر انیس، تسلیم، دبیر، نے پُر کیف، عالمانہ اور خوب

صورت تشبیہیں برتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعرا صرف تشبیہ برائے تشبیہ بھی لے آئے ہیں، جس سے کلام بے لطف اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔

ایک طرف ایسی بلیغ تشبیہات اور استعارے استعمال ہوئے:

سبزہ ہے کنار آب جو پر
یا خضر ہے مستعد وضو پر

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
اور آب رواں طواف میں ہے

دوسری جانب ایسی پست مثالیں بھی سامنے آئیں:

آ گیا وہ شجرِ حسن نظر جب ہم کو
بوسے لے کے لب شیریں کے چھوارے توڑے

مستی میں زلف یار کی جب لہر آ گئی
بوتل کا منہ ہمیں دہن مار ہو گیا

نسائیت: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنوی دبستان کی شاعری کا ایک اہم عنصر نسائیت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ: "ہر زمانے، ہر قصہ اور ہر زبان میں عورت شاعری کا بڑا اہم موضوع رہی ہے۔ لیکن لکھنؤ کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔" اس نے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دونوں پر ان کا صحت مند اثر پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں، جو صرف نفسِ حیوانی کو مسل کرتی تھیں۔ جب کہ دوسری طرف عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم کر کے ان کے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آ گئی۔ چنانچہ ریختہ کے جواب میں 'ریختی' تصنیف ہوئی۔ اس کا سہرا عام طور پر

سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا جاتا ہے۔ رنگین کے بعد انشا اور دوسرے شعرا نے بھی اسے پروان چڑھایا۔ ان شعرا کے ہاں ریختی کے جو نمونے ملتے ہیں، ان میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاوروں میں جس طرح ان لوگوں نے نظم کیا ہے، وہ لکھنؤ کی شاعری اور سوسائٹی کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گیا ہے۔

سوز و گداز: اس ساری بحث سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ لکھنوی شعرا کے ہاں اعلیٰ درجے کی ایسی شاعری موجود نہیں جو ان کے سوز و گداز، جذبات، احساسات اور واردات قلبی کی ترجمان ہو۔ تمام نقادوں نے اس بات کی تائید کی ہے بلکہ عندلیب شادانی، جنھوں نے لکھنوی شاعری کے خراب پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کیا ہے، وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعرائے لکھنؤ کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو پڑھنے والے کے دل پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ایسے نمونے ناسخ اور آتش کے علاوہ امانت اور رند وغیرہ کے ہاں سب سے زیادہ ملتے ہیں۔

یہاں اس بات کے ثبوت میں مختلف شعرا کے کلام سے کچھ مثالیں:

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

جنوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا
یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں، غم خوار اسے کہتے

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں
روز دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

حرم کو اس لیے اٹھ کر نہ بت کدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جورِ بتاں اٹھا نہ سکا

## مجموعی جائزہ

اردو ادب میں دونوں دبستانوں کی اپنے حوالے سے ایک خاص اہمیت ہے۔ دبستانِ لکھنؤ نے موضوعات کے بجائے زبان کے حوالے سے اردو ادب کی بہت خدمت کی اور ناسخ کی اصلاحِ زبان کی تحریک نے اردو زبان کو قواعد و ضوابط کے حوالے سے بہت زیادہ ترقی دی۔ جب کہ دبستانِ لکھنؤ کا اثر دہلی کے آخری دور کے شعراء، غالب، مومن، ذوق پر بھی نمایاں ہے۔

maablib.org

حصہ سوم

# اُردو ادب کی تحریکات

maablib.org

# اُردو ادب کی تحریکات

## سرسید تحریک

### پس منظر

برصغیر پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی اور سقوط دہلی کے بعد مسلمانانِ برصغیر کی فلاح بہبود کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی گئیں، عرف عام میں وہ سرسید تحریک یا ''علی گڑھ تحریک'' کے نام سے مشہور ہوئیں۔ سرسید نے اس تحریک کا آغاز جنگ آزادی سے، ایک طرح سے پہلے سے ہی کر دیا تھا۔ غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ لیکن جنگ آزادی نے سرسید کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان ہی واقعات نے علی گڑھ تحریک کو بارآور کرنے میں بڑی مدد دی۔ لیکن یہ پیش قدمی اضطراری نہ تھی، بلکہ اس کے پس پشت بہت سے عوامل کارفرما تھے؛ مثلاً راجہ رام موہن رائے کی تحریک نے بھی ان پر گہرا اثر چھوڑا۔

ہندوستان پر برطانوی تسلط کے سبب ہندوستانی دانش وروں اور مصلحین قوم نے دو مختلف بلکہ یوں کہیے کہ دو متضاد نظریات کو اپنایا۔ ایک نظریہ تو وہ تھا کہ جس کے داعی راجہ رام موہن

رائے جیوتی با پھلے اور بعد کی کئی مصلحین تھے۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم کی پُر زور حمایت کرتے تھے۔
یہاں ایک بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے انگریزی تعلیم کی بات اس وقت کی تھی، جب انگریز حکمرانوں نے اس بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ لارڈ میکالے کی مشہور زمانہ Minutes of Education راجہ رام موہن رائے کے انتقال کے دو برس بعد یعنی ۱۸۳۵ء میں شائع ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے اور میکالے کی نیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ راجہ رام موہن انگریزی تعلیم کے ذریعے ایک سائنٹفک اور معروضی طرزِ فکر رائج کرنے اور مذہبی توہم پرستی اور دوسری دوسری سماجی برائیوں کو مٹانے کی کوشش میں تھے۔ جب کہ میکالے انگریزی تعلیم سے ایک ایسے متوسط طبقے کا فروغ چاہتا تھا، جو حکمرانوں کی مشین کا پرزہ بن سکے۔

دوسرا نظریاتی اسکول ان قدامت پرستوں کا تھا جنھوں نے راجہ رام موہن کی مخالفت کی۔ انھیں غور سے دیکھا جائے تو اس مخالفت کا سبب نہ انگریز حکمران تھے نہ انگریزی زبان بلکہ وہ اصلاحات تھیں جن کے لیے راجہ رام موہن رائے کوشاں تھے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ راجہ موہن رائے نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہی جدید انگریزی تعلیم کے لیے کوشش شروع کر دی تھی، جب کہ مسلمانوں میں اس کا خیال بھی ۱۸۵۷ء تک نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سرسید اور ان کے رفقا کی علی گڑھ تحریک اس راستے پر گامزن ہوئی، جس کا سنگِ بنیاد راجہ رام موہن رائے اور ان کے ساتھی رکھ چکے تھے۔

لیکن سب سے بڑا واقعہ سقوطِ دلی کا ہی ہے۔ اس واقعے نے ان کی فکر اور عملی زندگی میں ایک تلاطم برپا کر دیا۔ اگرچہ اس واقعے کا اولین نتیجہ یا ردِ عمل تو مایوسی، پژمردگی اور نا امیدی تھا، تاہم اس واقعے نے ان کے اندر چھپے ہوئے مصلح کو بیدار کر دیا علی گڑھ تحریک کا وہ بیج جو زیرِ زمین پرورش پا رہا تھا۔ اب زمین سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا، چنانچہ اس واقعے سے متاثر ہو کر سرسید احمد خان نے قومی خدمت کو اپنا شعار بنالیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد خان کو انگلستان جانے کا موقع ملا۔ یہاں وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ ہندوستان میں بھی کیمبرج کی طرز کا ایک تعلیمی ادارہ قائم کریں گے۔ وہاں کے اخبارات اسپکٹیٹر،

اور گارڈین سے متاثر ہو کر، سرسید نے تعلیمی درس گاہ کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں انقلاب لانے کے لیے اسی قسم کا اخبار ہندوستان سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ ''رسالہ تہذیب الاخلاق'' کا اجرا، اس ارادے کی تکمیل تھا۔ اس رسالے نے سرسید کے نظریات کی تبلیغ اور مقاصد کی تکمیل میں اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔

## مقاصد

اس تحریک کے مقاصد کے بارے میں سب اہل الرائے حضرات متفق ہیں اور ان کی آرا میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ مثلاً احتشام حسین اس تحریک کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ''اس تحریک کے کئی پہلوؤں میں نئے علوم کا حصول، مذہب کی عقل سے تفہیم، سماجی اصلاح اور زبان وادب کی ترقی اور سربلندی شامل ہیں۔'' جب کہ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ: ''اس تحریک کے مقاصد میں مذہب، اردو ہندو مسلم تعلقات، انگریز اور انگریزی حکومت، انگریزی زبان، مغرب کا اثر اور تقاضے وغیرہ جیسے چند پہلو شامل ہیں۔''

ان آرا سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحریک کے مقاصد کے تین زاویے ہیں۔

الف، سیاسی زوایہ: جہاں تک سیاسی زاویے کا تعلق ہے، اگر دیکھا جائے تو جنگ آزادی کے بعد چونکہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد مسلمان جمود اور اضمحلال کا شکار ہو چکے تھے، جب کہ ہندوؤں نے انگریزوں سے مفاہمت کی راہ اختیار کر لی اور حکومت میں اہم خدمت انجام دے رہے تھے اور ان کے برعکس مسلمان جو ایک صدی پہلے تک ساری حکومت کے اجارہ دار تھے، اب حکومتی شعبوں میں ان کا تناسب کم ہوتے ہوتے ایک اور تین کا رہ گیا۔ علی گڑھ تحریک نے مسلمانوں کی اس پسماندگی کو سیاسی انداز میں دور کرنے کی کوشش کی۔ کالج اور ''تہذیب الاخلاق'' نے مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اور انھیں سیاسی طور پر ایک علیحدہ قوم کا درجہ دیا۔

ب، مذہبی زوایہ: مذہبی حوالے سے سرسید احمد خان نے مذہب کا خول توڑنے کے

بجائے فعال بنانے کی کوشش کی۔ ایک ایسے زمانے میں جب مذہب کے روایتی تصور نے ذہن کو زنگ آلود کر دیا تھا۔ سرسید احمد خان نے عقلِ سلیم کے ذریعے اسلام کی مدافعت کی اور ثابت کر دیا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو نئے زمانے کے نئے تقاضوں کو نہ صرف قبول کرتا ہے بلکہ نئے حقائق کی عقلی توضیح کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

ج۔ادبی زاویہ: علی گڑھ تحریک کا تیسرا فعال زاویہ ادبی ہے اور اس کے تحت نہ صرف اردو زبان کو وسعت ملی بلکہ اردو ادب کے اسالیبِ بیان اور روحِ معانی بھی متاثر ہوئے۔ اور اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ سرسید سے پہلے اردو ادبیات کا دائرہ تصوف، تاریخ اور تذکرہ نگاری تک محدود تھا۔ طبعی علوم، ریاضیات اور فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ بہت کم دی جاتی تھی۔ سرسید کا اثر، اسلوبِ بیان پر بھی ہوا اور موضوع پر بھی۔ اگرچہ سرسید سے پہلے فورٹ ولیم کالج کی سلیس افسانوی نثر، دہلی کی علمی نثر اور مرزا غالب کی نجی نثر جس میں ادبیت اعلیٰ درجے کی ہے، نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ان سب کوششوں کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا۔ سرسید احمد خان کی بدولت نثر میں موضوعات کا تنوع اور سادگی پیدا ہوئی۔

آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ سرسید تحریک نے اردو ادب کے کون کون سے شعبوں کو متاثر کیا۔

اردو نثر: چونکہ علی گڑھ تحریک نے قومی مقاصد کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا اور ان کا روئے سخن خواص سے کہیں زیادہ عوام کی طرف تھا، اور صرف شاعری اس تحریک کی ضرورت کی کفیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے علی گڑھ تحریک نے سستی جذباتیت کو فروغ دینے کے بجائے گہرے تعقل، تدبر اور شعور کو پروان چڑھانے کا عہد کیا تھا اور صرف اردو نثر ان مقاصد میں زیادہ معاونت کر سکتی تھی۔ چنانچہ ادبی سطح پر علی گڑھ تحریک نے اردو نثر کا ایک باوقار، سنجیدہ اور متوازن معیار قائم کیا اور اُسے شاعری کے مقفیٰ اور مسجع اسلوب سے نجات دلا کر سادگی اور متانت کی کشادہ ڈگر پر ڈال دیا اور یوں ادب کی افادی اور مقصدی حیثیت اُبھر کر سامنے آئی۔

سوانح اور سیرت نگاری: علی گڑھ تحریک نے سائنسی نقطہ نظر اور اظہار کی صداقت کو

اہمیت دی تھی اور اس کا سب سے زیادہ اثر سوانح اور سیرت نگاری کی صنف پر پڑا۔ اٹھارویں صدی میں عیسائی مبلغین نے ہادی اسلام حضرت محمد اور دیگر نام ور مسلمانوں کے غلط سوانحی کوائف شائع کرکے اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ عیسائی مبلغین کی ان کوششوں میں کبھی کبھی ہندو مورخ بھی شامل ہو جاتے تھے۔ علی گڑھ تحریک چونکہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو فروغ دے رہی تھی، اس لیے اسلام اور بانی اسلام کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیوں کے ازالہ کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ سرسید کی ''خطباتِ احمدیہ'' مولوی چراغ علی کے دو رسالے ''بی بی حاجرہ''، اور ''ماریہ قبطیہ'' ڈپٹی نذیر احمد کی ''امہات الا'' میں تاریخی صداقتوں کو پیش کیا گیا۔

لیکن اس دور کے سب سے بڑے سوانح نگار شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی تھے۔ مولانا شبلی نے نام ورانِ اسلام کو سوانح نگاری کا موضوع بنایا اور ان کی زندگی اور کارناموں کو تاریخ کے تناظر میں پیش کرکے عوام کو اسلام کی مثالی شخصیتوں سے روشناس کرایا، جب کہ مولانا حالی نے اپنے عہد کی عظیم شخصیات کا سوانحی خاکہ مرتب کیا۔ چنانچہ ''یادگارِ غالب''، ''حیاتِ جاوید'' اور ''حیاتِ سعدی'' اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس عہد کے دیگر لوگ جنھوں نے سوانح عمریاں لکھیں، ان میں ڈپٹی نذیر احمد، مولوی چراغ علی اور عبدالحلیم شرر شامل ہیں۔

**تاریخ نگاری:** سرسید احمد خان نئی تعلیم کے حامی اور جدیدیت کے علم بردار تھے، انھوں نے حضور نبی کریم کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کے لیے اخلاقیات کی خالص قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ علی گڑھ تحریک نے قومی زندگی میں جو ولولہ پیدا کیا تھا، اسے بیدار رکھنے کے لیے ملی تاریخ سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس تحریک نے تاریخ کو سپاٹ بیانیہ نہیں بنایا بلکہ اس فلسفے کو جنم دیا کہ تاریخ کے اوراق میں قوم اور معاشرے کا دھڑکتا ہوا دل محفوظ ہوتا ہے۔ جس کا آہنگ دریافت کر لینے سے مستقبل کو سنوارا اور ارتقا کے تسلسل کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ نظر سے سرسید احمد خان نے ''آئینِ اکبری''، ''تزکِ جہانگیری'' اور ''تاریخ فیروز شاہی'' دوبارہ مرتب کیں۔ شبلی نعمانی نے ''الفاروق''، ''المامون'' اور ''اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر'' لکھیں۔ مولوی

ذکاءاللہ نے "تاریخِ ہندوستان" مرتب کی۔

علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری کے ایک الگ اسلوب کی بنیاد رکھی۔ بقول سرسید، "ہر فن کے لیے زبان کا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز کو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کر دیتا ہے۔" اس لیے علی گڑھ تحریک نے تاریخ نگاری میں غیر شخصی اسلوب کو مروج کیا اور اسے غیر جانب داری سے تاریخ نگاری میں استعمال کیا۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ کا بیانیہ انداز، نثر کی بیشتر رعنائیوں کو زائل کر دیتا ہے۔ تاہم سرسید احمد خان تاریخ کو افسانہ یا ناول بنانے کے حق میں ہرگز نہیں تھے اور وہ شخصی تعصبات سے الگ رہ کر واقعات کی سچی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے تاریخ کے لیے سادہ اور بیانیہ نثر استعمال کرنے پر زور دیا۔ اور اس نقطۂ نظر کے تحت "آثار الصنادید" کی بوجھل نثر کو سادہ بنایا۔

**تنقید نگاری:** علی گڑھ تحریک نے زندگی کے جمال کو اجاگر کرنے کے بجائے مادی قدروں کو اہمیت دی۔ چنانچہ ادب کو بے غرضانہ مسرت کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے ایک ایسا مفید وسیلہ قرار دیا گیا جو مادی زندگی کو بدلنے اور اسے مائل بہ ارتقا رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ادب کا یہ افادی پہلو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تاہم یہ اعزاز علی گڑھ تحریک کو حاصل ہے کہ اردو زبان کے بالکل ابتدائی دور میں ہی اس کی عملی حیثیت کو اس تحریک نے قبول کیا اور ادب کو عین زندگی بنا دیا۔ اس اعتبار سے بقول سید عبداللہ، "سرسید سب پہلے ترقی پسند ادیب اور نقاد تھے۔ اول الذکر حیثیت سے سرسید احمد خان نے ادب کو تنقیدِ حیات کا فریضہ سرانجام دینے پر آمادہ کیا اور موخر الذکر حیثیت سے ادب کی تنقید کے موقر اصول وضع کر کے اپنے رفقا کو ان پر عمل کرنے کی تلقین کی۔"

اگرچہ سرسید احمد خان نے خود فنِ تنقید کی کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کے خیالات نے تنقیدی رجحانات پر بڑا اثر ڈالا۔ ان کا یہ بنیادی تصور کہ "اعلیٰ تحریر وہی ہے جس میں

سچائی ہو، جو دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے، بعد میں آنے والے تمام تنقیدی تصورات کی اساس ہے۔ سرسید احمد خان سے قبل عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی کو اعلیٰ نثر کی ضروری شرط خیال کیا جاتا تھا ،لیکن سرسید احمد خان نے مضمون کا ایک صاف اور سیدھا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے انداز بیاں کے بجائے مضمون کو مرکزی اہمیت دی اور طریق ادائی کو اس کے تابع کر دیا۔ سرسید احمد خان کے یہ تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ان سے سرسید احمد خان کا جامع نقطہ نظر مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس ضمن میں علی گڑھ تحریک نے ایک ان لکھی کتاب پر عمل کیا۔

علی گڑھ تحریک سے اگر پہلے کی تنقیدی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ تحریک سے قبل کی تنقید صرف ذاتی تاثرات کے اظہار تک محدود تھی۔ لیکن سرسید احمد خان نے ادب کو بھی زندگی کے مماثل قرار دیا۔ اور اس پر نظری اور عملی زاویوں سے تنقید کی۔ گو کہ سرسید احمد خان نے خود تنقید کی کوئی باضابطہ کتاب نہیں لکھی۔ تاہم ان کے رفقا میں سے الطاف حسین حالی نے "مقدمہ شعروشاعری" جیسی اردو تنقید کی باقاعدہ کتاب لکھی اور اس کا عملی اطلاق "یادگارِ غالب" میں کیا۔ مولانا حالی کے علاوہ شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات ان کی متعدد کتابوں میں موجود ہیں۔ ان نظریات کی عملی تقلید "شعرالعجم" ہے۔

سرسید نے صرف ادب اور اس کی تخلیق کو ہی اہمیت نہیں دی بلکہ انہوں نے قاری کو اساسی حیثیت کو بھی تسلیم کیا۔ انھوں نے مضمون کو طرزِ ادا پر فوقیت دی۔ لیکن انشا پردازی کے بنیادی تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ طرزِ ادا میں مناسب لطف پیدا کرکے قاری کو سحر اسلوب میں لینے کی تلقین بھی کی۔ چنانچہ ان کے رفقا میں سے مولانا شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں مضمون اور اسلوب کی ہم آہنگی فطری طور پر عمل میں آتی ہے اور اثر و تاثیر کی ضامن بن جاتی ہے۔ اگرچہ ان کے مقابلے میں حالی کے ہاں تشبیہ اور استعارے کی شیرینی کم ہے، تاہم وہ موضوع کا فکری زاویہ ابھارتے ہیں اور قاری ان کے دلائل میں کھو جاتا ہے۔ اس طرح مولوی ذکا اللہ کا بیانیہ سادہ ہے، لیکن خلوص سے عاری نہیں۔ نواب محسن الملک کا اسلوب تمثیلی ہے اور ان کی سادگی

میں بھی حلاوت موجود ہے۔

مضمون نویسی: اصناف نثر میں علی گڑھ تحریک کا ایک اور اہم کارنامہ مضمون نویسی یا مقالہ نگاری ہے۔اردو نثر میں مضمون نویسی کے اولین نمونے بھی علی گڑھ تحریک نے ہی فراہم کیے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سفر یورپ کے دوران سرسید احمد خان وہاں کے بعض اخبارات مثلاً ،اسپکٹیٹر، ٹیٹلر ،اور گارڈین وغیرہ کی خدمات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور سرسید احمد خان نے انھی اخباروں کے انداز میں ہندوستان سے بھی ایک اخبار کے اجرا کا پروگرام بنایا تھا۔ چنانچہ وطن واپسی کے بعد سرسید احمد خان نے ''رسالہ تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔اس رسالے میں سرسید احمد خان نے مسائلِ زندگی کو اسی فرحت بخش انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ،جو مذکورہ بالا رسائل کا تھا۔

سرسید احمد خان کے پیشِ نظر چونکہ ایک اصلاحی مقصد تھا،اس لیے ان کے مضامین میں اگرچہ انگریزی Essay کی پوری روح بیدار نہ ہو سکی، تاہم علی گڑھ تحریک اور'' تہذیب الاخلاق '' کی بدولت اردو ادب کا تعارف ایک ایسی صنف سے ہوگیا، جس کی جہتیں بے شمار تھیں اور جس میں اظہار کے رنگا رنگ قرینے موجود تھے۔

'' تہذیب الاخلاق '' کے مضمون نگاروں میں سرسید احمد خان ، محسن الملک ، اور مولوی پیر بخش کے علاوہ دیگر کئی حضرات شامل تھے۔ ان بزرگوں کے زیر اثر کچھ مدت بعد اردو میں مقالہ نگاری کے فن نے ہمارے ہاں بڑے فنون ادبی کا درجہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ محسن الملک ، وقار الملک ، مولوی چراغ علی ، مولانا شبلی اور حالی کے مقالے ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔

ناول نگاری: علی گڑھ تحریک میں اصلاحی اور منطقی نقطہ نظر کو تمثیل میں بیان کرنے کا رجحان سرسید احمد خان ، مولانا حالی اور محسن الملک کے ہاں نمایاں ہے۔ تاہم مولوی نذیر احمد نے اسے فن کا درجہ دیا اور تحریک کے عقلی زاویے اور فکری نظریے کے گرد جیتے جاگتے اور سوچتے ہوئے

کرداروں کا جمگھٹا کھڑا کر دیا۔ چنانچہ وہ تمام باتیں جنھیں سرسید احمد خان نسبتاً بے رنگ ناصحانہ لہجے میں کہتے ہیں، ڈپٹی نذیر احمد نے انھیں کرداروں کی زبان میں کہلوایا ہے اور ان میں زندگی کی حقیقی رمق پیدا کر دی ہے۔

اگرچہ زندگی کی یہ تصویریں بلاشبہ یک رخی ہیں اور نذیر احمد نے اپنا سارا زورِ بیاں، کرداروں کے مثالی نمونے کی تخلیق میں صرف کیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی مدنظر رکھنی چاہیے کہ سقوطِ دہلی کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیشِ نظر اس وقت مثالی کرداروں کو پیش کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ صاف اور واضح نظر آتا ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا حالی نے جو قوت اسلاف کے تذکروں سے حاصل کی تھی، وہی قوت نذیر احمد مثالی کرداروں کی تخلیق سے حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے ناول چونکہ داستانوں کے تخیلی اسلوب سے ہٹ کر لکھے گئے تھے اور ان میں حقیقی زندگی کی جھلکیاں بھی موجود تھیں، اس لیے انہیں وسیع طبقے میں قبولیت حاصل ہوئی اور ان ناولوں کے ذریعے علی گڑھ تحریک کی معتدل اور متوازن عقلیت کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس طرح نذیر احمد کی کاوشوں سے نہ صرف تحریک کے مقاصد حاصل ہوئے بلکہ ناول کی صنف کو بے پایاں ترقی ملی۔

**نظم نگاری:** علی گڑھ تحریک نے غزل کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس کا سبب خود سرسید احمد خان یہ بتاتے ہیں کہ: ”ہماری زبان کے علم و ادب میں بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت، عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجر کے قطعوں اور قصہ کہانی کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔“ اس بنا پر سرسید احمد خان نے غزل کی ریزہ خیالی کے برعکس نظم کو رائج کرنے کی سعی کی۔ نظم کے فروغ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی سے ”مسدسِ حالی“ لکھوائی اور پھر اُسے اپنے اعمالِ حسنہ میں شمار کیا۔

سرسید احمد خان شاعری کے مخالف نہ تھے لیکن وہ شاعری کو نیچرل شاعری کے قریب

لانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے محمد حسین آزاد کے نیچرل مشاعرے کی داد دی اور ان کی مثنوی ''خوابِ امن'' کو دل کھول کر سراہا۔ سرسید احمد خان کی جدیدیت نے اس حقیقت کو بھی پالیا تھا کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی خیالات کے فطری بہاؤ میں رکاوٹ ہے۔ چنانچہ انھوں نے بے قافیہ نظم کی حمایت کی اور لکھا کہ: ''ردیف اور قافیہ کی پابندی گویا ذاتِ شعر میں دخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج نہیں تھا اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے ہماری نظم صرف ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔'' چنانچہ سرسید احمد خان کے ان نظریات کا اثر یہ ہوا کہ اردو نظم میں فطرت نگاری کی ایک مؤثر تحریک پیدا ہوئی۔ نظم جدید کے تشکیلی دور میں علی گڑھ تحریک کے ایک رکن عبدالحلیم شرر نے سرگرم حصہ لیا اور ''رسالہ دل گداز'' میں کئی ایسی نظمیں شائع کیں، جن میں جامد قواعد وضوابط سے انحراف برت کر تخلیقی رو کو اظہار کی آزادی عطا کی گئی تھی۔

## مجموعی جائزہ

مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک ایک بہت بڑی فکری اور ادبی تحریک تھی۔ خصوصاً ادبی لحاظ سے اس کے اثرات کا دائرہ بہت وسیع ثابت ہوا۔ اس تحریک کی بدولت نہ صرف اسلوبِ بیان اور روحِ مضمون میں بلکہ ادبی انواع کے معاملے میں بھی نامورانِ علی گڑھ کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا۔ اور بعض ایسی اصنافِ ادب کو رواج دیا جو مغرب سے حاصل کردہ تھیں۔ ان میں سے بعض رجحانات خاص توجہ کے لائق ہیں: مثلاً، نیچرل شاعری کی تحریک، جس میں محمد حسین آزاد کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی بھی برابر کے شریک تھے۔ قدیم طرزِ شاعری سے انحراف بھی اسی تحریک کا ایک جزو ہے۔ اردو تنقیدِ جدید کا آغاز بھی سرسید احمد خان اور اُن کے رفقا سے ہوتا ہے۔ سوانح نگار، سیرت نگاری، ناول اردو نظم اور مضمون نگاری سب کچھ ہی سرسید تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔

# رومانوی تحریک

رومانوی تحریک کو عام طور پر سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کا ردعمل قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ سرسید احمد خان کی تحریک ایک اصلاحی تحریک تھی۔ یہ دور "تہذیب الاخلاق" کا دور تھا، جس کی نثر عقلیت، منطقیت، استدلالیت اور معنویت سے بوجھل تھی۔ مزید برآں 'تہذیب الاخلاق' کا ادب 'مذہبی، اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی اقدار سے گراں بار تھا۔ اس جذبے اور احساس کے خلاف رومانی نوعیت کا ردعمل شروع ہوا اور جذبے اور تخیل کی وہ رَو، جسے علی گڑھ تحریک نے روکنے کی کوشش کی تھی، ابھرے بغیر نہ رہ سکی۔

لیکن اس سے قبل کہ رومانیت یا رومانوی تحریک کے بارے میں بحث کریں، ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھ لیں کہ رومانیت سے کیا مراد ہے۔

## رومانیت کا مفہوم

رومانیت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں کہ "لفظ جتنا دل خوش کن ہے، تشریح کے لحاظ سے اتنا سہل نہیں۔ لغات اور فرہنگ، اصطلاحات کے انسائیکلو پیڈیا اور تنقید کی کتابیں اس سلسلے میں سب الگ الگ کہانی سنا رہی ہیں۔ اس لیے رومانیت کے متعلق کوئی معین بات کہنا چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت کے معنی رومانیت ہیں۔" بہرحال آگے چل کر وہ رومانیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "رومانیت کا ایک ڈھیلا سا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسے اسلوب اظہار یا انداز احساس کا اظہار کرتی ہے جس میں فکر کے مقابلے میں تخیل کی گرفت مضبوط ہو۔ رسم و روایت کی تقلید سے آزادی خیالات کو سیلاب کی طرح جدھر اُن کا رخ ہو، آزادی سے بہنے دیا جائے۔"

مختصر یہ کہ رومانی ادیب اپنے جذبے اور وجدان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلوب اور خیالات دونوں میں اس کی روش تقلید کے مقابلے میں آزادی اور روایت کی پیروی سے

بغاوت اور جدت کا میلان رکھتی ہے۔ رومانی ادیب، حال سے زیادہ ماضی یا مستقبل سے دلچسپی رکھتا ہے۔ حقائق واقعی سے زیادہ خوش آئند تخیلات اور خوابوں کی اور عجائبات وطلسمات سے بھری ہوئی فضاؤں کی مصوری کرتا ہے۔ دوپہر کی چمک اور ہر چیز کو صاف دکھانے والی روشنی کے مقابلے میں دھندلے افق چاندنی اور اندھیرے کی ملی جلی کیفیت اسے زیادہ خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن رومانیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: "رومانیت کا لفظ رومانس سے نکلا ہے۔ اور رومانس زبانوں میں اس کا طلاق اس قسم کی نثری منظوم کہانیوں پر ہوتا ہے، جن میں انتہائی آراستہ و پُر شکوہ پس منظر کے ساتھ عشق و محبت کی ایسی داستانیں سنائی جاتی تھیں جو عام طور پر دور وسطیٰ کے جنگجو اور خطر پسند نوجوانوں کی مہارت سے متعلق ہوتی تھیں۔"

اس طرح اس لفظ کے تین خاص مفہوم ہیں:

۱) عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانی کہا جانے لگا۔

۲) زبان کی بناوٹ، سجاوٹ، آرائش اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانی کہا جانے لگا۔

۳) عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں سے لگاؤ، قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانی کا لقب دیا گیا۔

## مغرب میں رومانیت

یورپ میں یہ تحریک کب اُبھری، اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ تاہم یہ بات وثوق سے کہی جاتی ہے کہ یورپ میں اس تحریک کا دور عروج اٹھارویں صدی کے وسط تک محیط ہے۔ اس تحریک کو سب سے زیادہ مقبولیت فرانس، انگلستان اور جرمنی میں حاصل ہوئی۔ ان ممالک میں اس کے پھیلنے کی وجہ حالات کی وہ تبدیلیاں تھیں، جن کے زیر اثر لوگوں کے خیالات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ تبدیلیاں یورپ کے سیاسی اور سماجی انقلابات کی مرہونِ منت ہیں۔

ادبیات کے سلسلے میں اس لفظ کو سب سے پہلے ۱۷۸۱ء میں وارٹن اور برڈ نے استعمال کیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۰ء میں گوئٹے اور شلر نے ادبیات کے سلسلے میں رومانیت کا اطلاق کرنا شروع

کیا۔ لیکن بطور اصطلاح اسے مادام ڈی سٹائل اور شیگل نے رائج کیا۔ یورپ میں رومانیت کا سب سے بڑا علم بردار روسو کو تسلیم کیا جاتا ہے، کیوں کہ سب سے پہلے روسو نے فرد کی آزادی پر زور دیا۔ چنانچہ روسو کی اس بات کو رومانیت کا مطلع کہا جاتا ہے: "انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر جہاں دیکھو وہ پابہ زنجیر ہے۔"

روسو کے خیال میں انسان کی ناخوشی کا سب سے بڑا سبب تصنع اور بناوٹ ہے، اور اس چیز کو وجود میں لانے کا سبب تہذیب و تمدن ہے۔ روسو کے خیالات نے اہلِ یورپ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ لیکن روسو کا میدان سیاست اور عمرانیات سے آگے نہیں بڑھا۔ جس کی وجہ سے ادب میں ان جدید رجحانات کی ابتدا بعد کے ادیبوں نے کی اور دھیرے دھیرے اصول وضوابط سے سرتابی کی روایت پیدا کی۔

## اردو میں رومانیت

اردو میں رومانیت کی ابتدا، اگرچہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہو چکی تھی۔ تاہم اسے فروغ بیسویں صدی کی پہلی عالمی جنگ کے بعد حاصل ہوا۔ اردو میں اس کا آغاز سرسید تحریک کے ردِعمل کے طور پر ہوا۔ سرسید نے عقلیت، مادیت اور حقائق نگاری پر بہت زیادہ زور دیا اور فرد کی زندگی کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ کچھ عرصہ تک یہ سکہ چلتا رہا، لیکن بالآخر سرسید کے عقلی اور مقصدی ادب کے خلاف رومانوی ادیبوں نے شدید احتجاج کیا اور اس طرح شعر وادب کی دنیا میں نئی راہوں کی نشان دہی کی۔ اس وقت کے حالات اور مغربی علوم کی آمد نے اس تحریک کو آگے بڑھنے میں مزید مدد دی۔

علی گڑھ تحریک کی عقلیت اور مادیت کے خلاف ردِعمل میں سرفہرست محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر تھے۔ ان لوگوں نے ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں ادیب کا تخیل جذبے کی جوئے تیز کے ساتھ چلتا رہے۔ لیکن آزاد کی رومانیت کسی ردِعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کی افتادِ طبع کی نقیب ہے۔ اس کے برعکس میر ناصر علی کا رومانی عمل، شعوری

نظر آتا ہے۔ میر ناصر علی نے سرسید احمد خان کے علمی و ادبی کارناموں پر نہ صرف تنقید کی ہے بلکہ انھوں نے سرسید کی سنجیدہ نثر کا جامد خول توڑنے کے لیے انشا پردازی کا شگفتہ اسلوب بھی مروج کرنے کی کوشش کی۔ اور انھوں نے سرسید کے مقابلے میں "فسانہ و ایام"، "صدائے عام" جیسے رسالے نکالے۔ عہد سرسید میں شدید جذباتی رویے اور رومانی طرز احساس کی ایک اور مثال عبدالحلیم شرر ہیں۔ شرر نے مسلمانوں کے اجتماعی اضمحلال کے خلاف ردعمل پیش کیا اور اس شان دار ماضی میں آسودگی تلاش کی جس میں مسلمانوں کے جاہ و جلال اور ہیبت و جبروت نے مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ رکھی تھیں۔

رسالہ مخزن: سر عبدالقادر نے بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی یعنی ۱۹۰۱ء میں لاہور سے ماہنامہ "مخزن" جاری کیا، جسے اردو کے علمی و ادبی رسائل میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس رسالے کی اشاعت سے نہ صرف یہ کہ رومانیت کی تحریک کو تقویت ملی بلکہ بعد میں آنے والی تحریکوں کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ اس رسالے میں اپنے دور کے تمام رومانیت پسندوں نے لکھا اور اس رسالے نے بہت سے ادیبوں کو اردو دان طبقے سے روشناس کرایا۔

ابوالکلام آزاد: مولانا ابوالکلام آزاد کی رومانی نثر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں کہ: "ان کی آواز بلندیوں سے آتی ہے اور ان کی بلند شخصیت کی طرح آسمانوں سے نیچے نہیں اترتی۔ وہ ایک پیغمبرانہ سکوت سے بولتے ہیں۔" ان کے لہجے میں انفرادیت کی وہ کھنک ہے جو اس دور کے کسی اور نثر نگار کے ہاں نہیں ملتی۔ بقول قاضی عبدالغفار: "اردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے نثر کو نثریت سے آزاد کرایا اور ایک علیحدہ اسلوب کی بنیاد رکھی۔ ان معنوں میں آزاد، جدید عہد کے پہلے صاحب طرز نثر نگار ہیں، جس نے اپنے طرز کے زیر اثر حکومت و فلسفہ کے دبستانوں کو اپنے نغمہ و رنگ کے آگے بے کیف کر دیا۔ ان کی نثر حکیمانہ ہونے سے زیادہ کچھ اور بھی ہے۔ انھوں نے ہمارے ایشیائی ذہنوں پر انفرادیت کے تازیانے مارے۔ پستی اور

محرومی، ذلت اور کم ہمتی کا احساس دلایا ہے، جو تبدیلی کی شدید خواہش اور حال سے بے پناہ نفرت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ ان کی نثر نے اردو ادب کو ایک نیا اعتبار بخشا۔ البتہ ان کی نثر کی ایک خامی ہے کہ اس پر ابوالکلام کے مطالعے کا بوجھ لدا ہوا ہے اور قاری اس سے متاثر ہونے کے بجائے فوراً مرعوب ہو جاتا ہے۔ ان کی نثر کا تانا بانا خاصا الجھا ہوا ہے اور اس کی تقلید آسان نہیں۔

## رومانوی شاعر

رومانوی فکر شاعروں پر بھی کافی حد تک اثر انداز ہوا۔ اور اُس دور کے بہت سے شعرا نے اس اثر کو اپنایا۔ جن میں زیادہ تر شعرا آہستہ آہستہ سفر کرتے ہوئے انقلاب اور حقیقت پسندی کی طرف گئے۔ اُس دور کے رومانی طرزِ فکر رکھنے والے شعرا مندرجہ ذیل ہیں:

**علامہ اقبال:** رسالہ مخزن میں لکھنے والوں میں سرِ فہرست شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے اکثر ناقدین کا کہنا ہے کہ اقبال کی شاعری میں رومانوی اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں جذبات اور وجدان کی افراط اور غلبہ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر ان کو رومانوی شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ علامہ اقبال نے عقل و عشق کے لفظوں سے نیا جہاں بسایا اور اس جہان کی تعمیر میں جذبہ اور وجدان کی اہمیت بنیادی ہے۔ لیکن علامہ اقبال روسو کی طرح خودی کو بے پناہ جذبے کی شدت پر عقل کے ذریعے نہیں بلکہ عشق یعنی ایک شدید جذبے کی مدد سے قابو حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ اقبال نے اپنے کلام میں جگہ جگہ جذبے اور وجدان کی بنیادی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مثلاً،

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

علامہ اقبال کی رومانیت کا ذکر کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں کہ: "یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران ہی علامہ اقبال، رومانی شعرا میں متعارف ہوئے، اس شاعری کو پسند کرنے لگے بلکہ رومانیت نے ان کے قلب وذہن پر قبضہ جمالیا۔"

نقادوں نے اقبال کے ہاں رومانوی زاویوں کی نشان دہی کی، وہ تین ہیں؛ جن میں حسنِ ازل کی طلب وجستجو، ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرنا اور رومانی کرداروں کی تخلیق شامل ہے۔

**اختر شیرانی:** اردو رومانی شعرا میں ایک اہم نام اختر شیرانی کا ہے۔ اختر کی شاعری میں یک مخصوص رومانی نقطہ نظر ملتا ہے۔ اُن کے یہاں حال سے گریز اور فرار کا رجحان نمایاں ہے۔ اختر زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے کے بجائے تخیلی زندگی میں پناہ لیتے ہیں۔

اختر شیرانی کی شاعری میں عورت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی تاریخ میں پہلی بار اپنی محبوباؤں کے نام کے کھلم کھلا اور بے دھڑک پُر جوش جذبات محبت ادا کیے اور اپنی محبت کو اصل حیات قرار دیا۔ اختر شیرانی نے متوسط طبقے کی دوشیزہ کو معشوقہ بنا کر اس کا نام لے کر شعر کہنے کی روایت ڈالی۔ چنانچہ وہ کبھی سلمٰی کے رومان کے حسین کے تذکرے کرتے ہیں اور کبھی عذرا، ناہید، پروین اور کبھی شمسہ کے زہر آلود ہونٹوں کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ماورائی لطافت اور سرمستی کی جس طرح پرستش کی ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص محبوبہ کے غمزوں کا شکار ہونے سے زیادہ سرمستی وعشق پر عاشق ہے۔ اختر کی گوشت پوست کی عورت میں بھی تخیل کا شبہ ہوتا ہے۔ اختر کی بعض نظموں میں وطن پرستی کے جذبات بھی ادا ہوئے ہیں۔ تاہم وطن کا یہ روپ بھی نسائیت کا حامل ہے۔ لیکن وطن ایک ایسی محبوبہ ہے، جسے اختر نے ٹوٹ کر پیار کیا اور اس کی جدائی اس کے دل کو غموں اور دکھوں سے ہم کنار کردیتی ہے۔

مختصر یہ کہ، اختر شیرانی متنوع جہات شاعر نہیں۔ ان کی شاعری کی سطحی جذباتیت نے انھیں صرف نوجوانوں کا شاعر بنا دیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اختر رومانیت کی ایک توانا آواز ہیں۔

محبت کے لیے آیا ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے میرے دل میں

ہر اک شاعر مقدر اپنا اپنے ساتھ لایا ہے
محبت کا جنوں تنہا میرے حصے میں آیا

**حفیظ جالندھری:** حفیظ جالندھری کا شمار رومانوی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں ماضی پرستی کا رجحان غالب ہے۔ وہ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایک طویل نظم "شاہنامہ اسلام" خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ماضی پرستی کے علاوہ حفیظ جالندھری کے ہاں فطرت پرستی کا رجحان غالب ہے۔ انھوں نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان نظموں میں فطرت کو تشبیہ کی مدد سے مجسم کیا گیا ہے۔ فطرت ایک خاص انداز اور جسمانی پیکر کے ساتھ برآمد ہوتی ہے۔ "اٹھی حسینہ سحر" میں یہ عمل کامیاب ہے۔ حفیظ نے ہندی لفظیات اور نرم و نازک الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ترنم اور موسیقیت کی طرف بھی انھوں نے خصوصی توجہ دی ہے۔ ور بحروں کے انتخاب اور الفاظ کی ترتیب سے آہنگ نغمہ پیدا کیا۔ نظموں کی ظاہری شکل وصورت میں بھی انھوں نے انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔

**جوش ملیح آبادی:** جیلانی کامران، جوش ملیح آبادی کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جوش بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں، لیکن ان کی رومانیت پیکر اور اجسام کی خوب صورتی ہی کا ذکر کرتی ہے۔" ڈاکٹر محمد حسن، جوش کے متعلق لکھتے ہیں کہ "جوش، جمالیات اور تلاشِ حسن سے زیادہ شدت جذبات کے پرستار ہیں۔ ان کی رومانیت کی عام شکل مبہم افسردگی، نسوانیت اور ماورائیت نہیں بلکہ گھن گرج، انقلابی آن بان اور پہاڑوں سے ٹکرانے والے ولولے کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔" جوش کی پوری شاعری شبابیات کی شاعری ہے۔ وہ جذبے کی

بے باک سرکشی کے قائل ہیں۔ اس کی تڑپ کے پرستار ہیں اور اسی تڑپ، اس جذباتی احساس کو ادارک کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جوش کے کلام میں فلسفیانہ مضامین بھی ہیں۔ انھوں نے سائنس اور حکیمانہ شعور کی تعریف بنی نہیں کی اسے برتا بھی ہے لیکن ان سب کے باوجود جوش کا بنیادی نغمہ رومانوی ہے۔ ان کے فن میں مختلف رجحانات اور ارتقائی منزلیں اور ادوار ملتے ہیں لیکن جذبات و احساسات پر ان کا زور ہر جگہ قائم رہتا ہے۔

احسان دانش: نوائے کارگر، آتشِ خاموش، چراغاں، شیرازہ، مقامات، زخم و مرہم اور فصلِ سلاسل، احسان دانش کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کی شاعری میں درد و سوز و، غم روزگار اور زندگی کے نشیب و فراز کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کی رومانیت نے غربت کے داخلی احساس سے جنم لیا ہے۔ ان کی شاعری میں مسرت کا لمحہ نایاب اور زندہ دلی کا شدید فقدان ہے۔ ان کے ہاں آنسوؤں اور آہوں کی کمی نہیں۔ احسان دانش کے آنسو انسانی دردمندی کے وفور سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ اس وقت بہتے ہیں، جب تک انسانیت پر زوال آ جاتا ہے اور پست و بلند میں امتیاز پیدا کر دیا جاتا ہے۔ احسان دانش کی رومانیت میں ماضی کی یادوں اور فطرت پرستی کو اہمیت حاصل ہے۔ اس رومانیت کے نقوش ان کی نظموں ''شامِ اودھ''، ''بیتے ہوئے دن''، ''صبحِ بنارس'' وغیرہ میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر: ڈاکٹر محمد دین تاثیر کی شاعری کا مجموعہ ''آتش کدہ'' رومانی شاعری کا ایک نمونہ ہے۔ وہ بیک وقت رومانوی تحریک سے بھی وابستہ ہیں اور ترقی پسند تحریک سے بھی۔ ان کی نظمیں، انسان، دہقان کا مستقبل، ترقی پسندوں جیسا اسلوب بیان لیے ہوئے ہیں۔ رس بھرے ہونٹ، دیوداسی، لندن کی ایک شام، اور مان بھی جاؤ، جیسی نظموں میں وہ رومانی شاعری نظر آتے ہیں۔ ان کی آزاد نظموں پر مغرب کے رومانی شاعروں کا گہرا پرتو ہے۔

ساغر نظامی: ساغر نظامی کی شاعری میں خود پسندی نے ایک قدر کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ذات میں کائنات کا جلوہ دیکھا اور رومانی کرنیں بکھیرنے کے بجائے انھیں اپنی شخصیت کے نقطے پر مرتکز کرنے کی شعوری کاوش کی۔ ساغر کی رومانیت خود پسندی اور انائے ذات کا زاویہ بھی پیش کرتی ہے۔ اسے نہ صرف اپنے وجود کا احساس ہے۔ بلکہ وہ یہ باور کرانے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ وہ اپنے عصر کی آواز ہے اور تغیر کی قوت اس کی ذات میں موجود ہے۔

## رومانی افسانہ

ایک طرح سے اردو میں افسانے کا آغاز ہی رومانی تحریک سے ہوتا ہے۔ اردو ادب میں افسانے میں زیادہ تر دو رجحانات غالب رہے ایک رومانی رجحان اور دوسرا ترقی پسند تحریک کا رجحان۔ ترقی پسند یا حقیقت پسند رجحان کی طرح رومانی رجحان بھی ایک مضبوط رجحان ہے، جس کا اثر ہر عہد کے افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رومانوی افسانہ چاہے کیسا بھی ہو لیکن اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ اردو میں افسانے کی ابتدا رومانیت پسندوں کے ہاتھوں ہوئی۔ آیئے چند اہم افسانہ نگاروں کے کام کا جائزہ لیتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم: سجاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ ر.مانیت یلدرم کی شخصیت بھی ہے اور ان کا اسلوب فن بھی۔ ابتدائے شباب میں ہی رومانی قسم کی بغاوت ان کے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہ تھے، اُسے اپنے ذہن و خیال کے مطابق منقلب کرنے کے آرزومند تھے۔

یلدرم ترکی ادب سے متاثر ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی میں صرف "محبت" ایک ایسا عنصر ہے جو ادب اور افسانے جیسی صنف لطیف کا موضوع بن سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے، جس میں پھنس کر ادیب، مصلح اور ادب

کو چند وواعظ بننا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کو عورت اور فطرت کے حسن اور ان دونوں کے فطری رومان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا موضوع عورت اور مرد کی وہ محبت تھی جو فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور قسم کی رسوم و قیود کی پابند نہ تھی۔ اس بات کا اظہار انھوں نے اپنے افسانوں میں کھلے طور پر کیا ہے۔ مثلاً ''خارستان وگلستان'' میں لکھتے ہیں کہ: ''عورت! عورت! عورت! ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کر اسے تازگی، اسے زینت بخش دیتی ہے۔''

''عورت میں حسن نہ ہوتا تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی۔ مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی تو عورت کی خوب صورتی اور دلبری رائیگاں جاتی۔''

یلدرم کی رومانیت کا ذکر کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں کہ: ''یلدرم کی عطا یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو تعلیم یافتہ عورت سے متعارت کرایا اور زندگی میں اس کے کردار کو تسلیم کیا۔'' اس میں کوئی شک نہیں جب رسوا نے امراؤ کو اردو میں پیش کیا تھا تو وہ بالواسطہ طور پر ایک طوائف کو کوٹھے سے اتار کر خانہ نشین بنانے کے آرزومند تھے۔ جب کہ یلدرم نے اس خانہ نشین کو حریم ناز سے نکلنے اور اپنی لطافتوں سے زندگی کو عطر بیز کرنے کی راہ سمجھائی۔

یلدرم محبت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں چاہتے۔ وہ دو محبت کرنے والوں کے وصال میں مانع ہو۔ وہ ان تمام قدروں کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں جو آزادی کی راہ میں حائل ہیں۔ جنسی مسائل پر وہ بالکل جذباتی نہیں ہوتے۔ یلدرم عریانیت اور سماجی قدروں سے براہِ راست تصادم سے بچنے کے لیے اپنے افسانوں میں ہزاروں برس قبل کی کسی اجنبی دنیا کے قصے بیان کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ یلدرم کی رومانیت میں ایک ایسا معصوم تحیر موجود ہے جو بچے کے چہرے پر کھلونے حاصل کرنے کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی رومانیت میں گہرائی یقیناً نہیں لیکن جذبے کی سادگی اور ملائمت موجود ہے۔

**نیاز فتح پوری:** نیاز فتح پوری کے افسانے اس بناوٹی وجود اور غیر حقیقی زندگی کی سب

سے بڑی مثالیں ہیں۔ "شاعر کا انجام"، "شباب کی سرگزشت" کے طرز تحریر اور اسلوب فکر میں "گیتا نجلی" کی سی روحانی ہم آہنگی جاتی ہے۔ وہی شکل، وہی انداز بیان اور تمنا پسندی، وہی بات سے بات پر وجد کرنے اور ہر چیز کو اس طرح دیکھنے کی کوشش جیسے اس کا ماورائی وجود ہے اور وہی حسن و عشق کے بارے میں فلسفیانہ طرز خیال۔ ان سب چیزوں نے اردو افسانہ کو بڑی مدت تک متاثر رکھا ہے۔

ان کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ ارضی چیز نہیں ملتی، ماروائی چیزیں ملتی ہیں۔ کردار نگاری میں بھی ماورائی یکسانیت ملتی ہے۔ ان میں عام انسانی کرداروں کی نوک پلک انداز و ادا اور ارتقا نہیں ملتا۔ شروع سے لے کر آ کر تک ایک بنیادی نغمہ ہے جو شخصیت پر حاوی ہے۔ ان کا اپنا کوئی لہجہ زبان اور انداز گفتگو نہیں۔ یہ سب نیاز کی بنی سجائی بے حد ادبی زبان ہے۔ انداز بیان کا انداز مکالموں کی عبارت سے ہوتا ہے۔ یہ نثر غالب و بیدل زدہ شاعری کے مماثل ہے۔ مناظر فطرت کا بے حد جذباتی بیان اور وفور شوق، تشبیہ اور استعارے کی بہتات کے ساتھ ملتا ہے۔

**حجاب امتیاز علی:** ان کی شعریت اس سے بھی زیادہ آراستہ اور ماورائی ہے اور اس میں جذبات کی فراوانی اور حسن معصوم کی دل کشی ہے۔ ان کے ہاں تحیر کا عنصر ہے۔ حجاب کی کہانیاں ایک خاص انداز میں واحد متکلم کے صیغے میں لکھی گئی ہیں اور ان کے سب کردار کم و بیش جانی پہچانی شخصیتیں ہیں۔ روحی، ان کا اپنا نام ہے جسے وہ ارضی سرزمین کی خوش گوار سیاحت میں ساتھ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر یزدانی، شہزادہ مشہدی ایسے نام ہیں جو ان کے قاری کے دوست اور آشنا ہوں۔

**مجنوں گورکھپوری:** مجنوں گورکھپوری نے نیاز فتح پوری کے زیر اثر افسانہ نگاری شروع کی۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "زیدی کا حشر"، ہے جو کہ "شباب کی سرگزشت" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مجنوں کے افسانوں میں رومانیت کی ایک سنبھلی ہوئی شکل ملتی ہے۔

اس میں جذبے کے وفور کے ساتھ ساتھ تکنیک کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ دوسرے رومانوی ادیبوں کی طرح مجنوں گورکھپوری کے کردار بھی غیر دلچسپ، کاروباری دنیا میں گھری ہوئی اجنبیت اور تصور پرست روحیں ہیں، جو یہاں خواب دیکھنے آتی ہیں اور جن کی تعبیر میں درد والم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کے ہاں جذبہ ہے جو ناکامیوں سے تھک کر خود اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔ ان کا ہیرو وقت سے پہلے جوان ہو گیا ہے۔ اور جب وہ اپنے معصوم تصورات کو شکست ہوتے دیکھتا ہے تو خود بھی اپنے آپ کو تکلیف دینے اور عذاب میں مبتلا کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ یگانہ، ثریا، ناصری سب اپنی شکست کی آوازیں ہیں۔ مجنوں کی کہانیوں میں محبت، ناکامی کا دوسرا نام ہے، جس کی سزا اور پاداش سوائے گھل گھل کر مرنے کے اور کچھ نہیں۔

غرض یہ کہ مجنوں کا انداز بیاں نیاز اور خلیقی دونوں سے زیادہ سلجھا ہوا ہے۔ اس میں دشوار شاعرانہ نثر کی فراوانی نہیں۔ وہ قصے بیان کے انداز میں لکھتے ہیں۔ لیکن بات بات میں شعر پڑھنا اور موقع بے موقع اشعار نقل کرنا ان کے رومانوی طرز تحریر کی خصوصیت ہے۔ اکثر ان کے کردار اشعار میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جذباتی سپردگی کے آئینہ دار ہیں، جنھوں نے اردو افسانہ نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے۔

اس کے علاوہ ناول کے حوالے سے قاضی عبدالغفار نے رومانوی طرز کو نئے حسن سے آشنا کیا۔ "لیلیٰ کے خطوط" فنی حیثیت سے ناول نہیں کہلا سکتے ہیں، لیکن ان میں جذبات کی فروانی اور خطابت کا جوش ہے اور اس لحاظ سے وہ مکمل رومانوی تخلیق ہیں۔

## مجموعی جائزہ

مجموعی طور پر رومانی تحریک نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کیے، وہ گو کہ دیرپا ثابت نہیں ہوئے، لیکن ان کا تسلسل کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔ نیز اس تحریک کے زیر اثر مختلف اصناف میں جو ادب تخلیق ہوا، وہ اردو کا گراں بہا سرمایہ ہے، جس سے مفر ممکن نہیں۔

# ترقی پسند تحریک

## عالمی پس منظر

ترقی پسند تحریک اور اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو بھی جاننا اور سمجھنا ہوگا، جو اس کے وجود پذیر ہونے کا سبب بنے، اور اس کے لیے تاریخ کے کچھ اوراق کو کھنگالنا ہوگا۔

ایک طرف ہمیں ہندوستان پر برطانوی استبداد اور اس کے ردعمل پر نظر ڈالنا ہوگی، دوسری طرف یورپ میں بدلتے نظام اور دنیا پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا ہوگا۔

انگلستان میں صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ نظام اپنا تسلط کھو رہا تھا۔ سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ سرمائے، پیداوار اور مزدور کے رشتوں میں نمایاں تبدیلیاں آرہی تھیں۔ یوں تو جاگیردارانہ نظام بھی ایک ایسا ہی معاشرہ تھا، جس کی بنیاد استحصال پر تھی۔ مگر صنعتی نظام اس سے دو قدم آگے تھا۔ اس نئے نظام نے مزدور کے استحصال ان گنت نئے مواقع فراہم کر دیے۔ جاگیردارانہ نظام کے مزدور یعنی کسان کا بہرحال پیداوار سے ایک رشتہ تھا۔ صنعتی نظام میں مزدور اور پیداوار کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ جاگیردارانہ نظام جو زراعتی نظام تھا، وہاں عملاً دو ہی طبقات تھے؛ جاگیردار اور کسان۔ استحصال بھی براہ راست اور سادہ تھا، مگر سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے معاشی استحصال کا کارخانہ چلانے کے لیے مزدوروں کے علاوہ کچھ پڑھے لکھے لوگوں کی بھی ضرورت تھی، لہٰذا سرمایہ دار اور مزدور کے بیچ ایک نیا طبقہ ابھرا، جسے ہم متوسط طبقہ کہتے ہیں۔ یہ طبقہ تعلیم یافتہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسی طبقے سے ایسے لوگ اٹھے، جنھوں نے سرمایہ دارانہ استحصال کے خلاف مزدور کی آواز سے آواز ملائی۔

مجموعی صورت حال یہ تھی کہ نہ صرف مزدور کا بدترین استحصال ہو رہا تھا بلکہ اس استحصال کی ڈھٹائی سے حمایت بھی کی جارہی تھی، اس کا ردعمل تو ہونا ہی تھا اور وہ ہوا۔ ۱۸۴۸ء میں جب ایک کتابچہ شائع ہوا تو معلوم نہیں کتنے لوگوں کو یہ احساس یا علم تھا کہ یہ کتابچہ انسانی تہذیب و تمدن

کے تقریباً ہر گوشے کو متاثر کرنے والا تھا۔ دنیا کا تقریباً ہر ملک اس کتابچے کی موافقت یا مخالفت میں لیکن بہر حال اس کتابچے کے باعث اپنے اندر کوئی تبدیلی لائے گا۔ یہ کمیونسٹ مینی فیسٹو تھا۔

یہی کمیونسٹ مینی فیسٹو تقریباً نوے برس بعد ایک نوجوان اردو شاعر نے بھی پڑھا جو اس وقت تک محض رومانوی شاعری کر رہا تھا، جس کا ذکر وہ اپنے ایک خط میں یوں کرتا ہے:

''ایک دن صاحب زادہ محمود الظفر نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا: یہ پڑھو، لیکن یہ غیر قانونی کتاب ہے، اس لیے ذرا احتیاط سے رکھنا۔ یہ کتاب تھی، کمیونسٹ مینی فیسٹو، جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پورے خزانہ و اسرار کی کنجی تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنے دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں۔ پھر سوویت معاشرت کے بارے میں دوسرے انقلابیوں کی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اسی زمانے میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی۔ یہ سب پڑھ کے ہم نے اس دوسری تصویر میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔''

فیض احمد فیض کا یہ خط ہمیں اس تحریک کے اردو ادب میں در آنے کا پتہ دیتا ہے۔

## ہندوستانی پس منظر

ترقی پسند تحریک کا یہ بین الاقوامی پس منظر انتہائی اہم ہے لیکن محض پس منظر مکمل تصویر نہیں ہوتا۔ ہم ہندوستانی ترقی پسند تحریک کو اس کی اپنی زمین کے تاریخی، سماجی، سیاسی اور معاشی سیاق و سباق میں رکھے بغیر پوری طرح نہیں پرکھ پائیں گے۔

ہندوستان میں راجہ موہن رائے نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہی جدید انگریزی تعلیم کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ جب کہ مسلمانوں میں اس کا خیال بھی ۱۸۵۷ء تک نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سرسید اور ان کے رفقا کی علی گڑھ تحریک اس راستے پر گامزن ہوئی۔ سرسید اور ان کے رفقا کی پرزور مخالفت بھی ہوئی۔ لیکن انھوں نے اپنا مشن ثابت قدمی سے جاری رکھا۔

مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ سرسید اور ان کے رفقا نے اسلام

کے بعض اصولوں پر از سر نو سوچنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اس ضمن میں سرسید، محسن الملک، اور چراغ علی تحریریں آج بھی دستیاب ہیں، جن میں اسلامی عقائد کی لبرل اور سائنٹفک تشریحات ملتی ہیں۔ تاہم اس محاذ پر ولی گڑھ تحریک کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس تحریک نے کہیں مسلمانوں کے اونچے اور متوسط طبقے میں ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جو آگے چل کر ترقی پسند خیالات اور نظریات کے لیے سازگار ثابت ہوا۔

حالی کا شمار بھی سرسید کے رفقا میں ہوتا ہے، ان کا 'مقدمہ شعر و شاعری' اردو کی ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔ گو کہ اس کی کئی معروضات کچھ لوگ قبول نہیں کر پائے اور اس زمانے میں اس پہ خاصی لے دے بھی ہوئی۔ سرسید اور حالی کا خوب خاکہ اڑایا گیا۔ بہر کیف، مقدمے کی تاریخ اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ حالی نے اس میں اردو شاعری اور خصوصاً غزل میں اصلاح کی بات کی۔ وہ اردو کی کلاسیکی شاعری میں گھسے پٹے موضوعات شمع و پروانہ، گل و بلبل، عاشق و معشوق، جام و مینا وغیرہ پر مسلسل طبع آزمائی کے خلاف تھے۔ 'مقدمہ شعر و شاعری' میں ادب میں مقصدیت اور ادب کے افادی پہلو کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ دوسری جانب نثر میں اسی نوعیت کا اجتہاد محمد حسین آزاد نے شروع کیا ہوا تھا۔ انھوں نے اردو نثر میں نت نئے تجربات کیے اور انھیں فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ سرسید تحریک کے دیگر ارکان شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد، مہدی افادی اور دیگر بھی اس جہاد میں پیش پیش تھے۔ لیکن حقیقی معنوں میں حالی اور ان کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد کو بھی ترقی پسند تحریک کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔

## آغاز

دوسری عالمی جنگ نے جہاں مجموعی طور پر معاشی سماجی اور سیاسی سطح پر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، وہیں سرمایہ دارانہ اجارہ داری کو ایسا مضبوط ستون میسر کر دیا جس کے نیچے عام آدمی معاشی سطح پر مزید پستیوں کا شکار ہونے لگا۔ ایوانوں میں عوام کی نمائندگی کرنے والے سیاست کے داؤ پیچ میں الجھ کر رہ گئے۔ عوام کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔ ایسے میں علمی، عقلی و سائنسی بنیادوں پر

ایک منظم تنظیم کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی چونکہ دیگر معاشرتی سطح کے ساتھ، ساتھ ادبی سطح پر بھی مستقل جمود کی کیفیت طاری تھی۔ ماضی کی طرح اس وقت بھی ادب حسن وعشق کے موضوعات تک محدود تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ادیبوں پر اہم ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ عوام کی نظریاتی اور فکری تربیت کریں اور ان کی نمائندگی کا فرض ادا کریں۔

۱۹۳۵ء میں گورکی، رومین رولاں، تھامس مان، ہنری باربوس اور آندرے مالرو کی رہنمائی میں ادب اور تہذیب کی حفاظت کے لیے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی۔ ساری دنیا کے بڑے بڑے ادیب شریک ہوئے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کا کوئی بڑا ادیب اس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکا، البتہ سجاد ظہیر اور راج آنند نے جو اس زمانے میں لندن ہی میں تھے، کانفرنس میں شرکت کی۔

پیرس کانفرنس سے چند ہی ماہ قبل ان دونوں ادیبوں نے لندن میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کی مدد سے ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانے کے خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ لندن کے نانکنگ ریستوران میں اس کا پہلا اعلان نامہ مرتب کیا گیا، جس پر ہندوستان کے بڑے بڑے ادیبوں نے دستخط کیے۔ اس اعلان نامے کی ابتدائی چند سطور میں ہی انجمن کا منشور واضح کر دیا گیا تھا:

"ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پسند طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب اور فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے: یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں"۔

یہ انداز فکر ہندوستان کے ادیبوں کے لیے بالکل نئی آواز تھا۔ اس طرح کی آواز ہندوستان کے ادبی ایوانوں میں پہلے کبھی نہیں گونجی تھی۔ یہ ایسی توانا اور مستحکم آواز تھی کہ جس کی گونج پر ہندوستان کے تمام بڑے ادیب لبیک کہتے ہوئے اس پلیٹ فارم پر آ کر جمع ہوئے جس کے باعث یہ اردو کی توانا ترین تحریک بن کر ابھری۔ مندرجہ بالا اعلان نامے کی بنیاد پر اپریل ۱۹۳۶ء

میں انجمن کی پہلی کانفرنس لکھنؤ میں منشی پریم چند کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔

پریم چند نے اپنے خطبے کی ابتدا، ان الفاظ سے کی: "حضرات یہ جلسہ ہمارے ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے"۔

اور حقیقتاً یہ اردو ادب میں بہت ہی واضح تاریخی موڑ تھا۔ اس موڑ سے ایسی تحریک نے جنم لیا جو اپنی وسعت، ہمہ گیری اور دُور رس نتائج کے اعتبار سے سرسید اور حالی کی تحریک سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوئی۔ قدامت پسندوں کی مخالفتوں کے باوجود یہ تحریک بڑی تیزی سے پھیلی اور ایک وسیع حلقے کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اس عہد میں اردو کا شاید ہی کوئی ادیب ہوگا جس نے اس تحریک سے اثر نہ لیا ہو، اکثریت اس سے متاثر تھی، باقی چند ایک وہ تھے جو اس کے مخالف رخ میں کھڑے تھے، لیکن اس مخالفت کا سبب بھی نظریاتی کم اور نجی زیادہ تھا، جس کا تذکرہ آگے چل کر آئے گا۔

## تحریک کے مقاصد اور ادب کی ترویج میں اس کا کردار

انجمن کی پہلی کانفرنس میں منشی پریم چند نے اپنے خطبہ صدارت میں انجمن کے مقاصد واضح کرتے ہوئے برملا کہا تھا کہ، "...... ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگا"۔

ممتاز شیریں کے الفاظ میں، ترقی پسند ادب کی مختصر تعریف یوں کی جاسکتی ہے: "وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے، جس میں زندگی کی تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو۔"

ترقی پسند تحریک نے ادب کو زندگی کے مادی رشتوں سے منسلک کیا۔ خالص داخلیت اور روحانی ماورائیت کے اثر سے آزاد کیا گیا۔ معاشی، سماجی اور نفسیاتی مسائل کا ترجمان بنایا اور ادب میں نئے تجربات کی راہیں کھولیں۔ اس نے اپنی انقلابی رجائیت سے دنیا کے محنت کش عوام کو زندگی کا پیغام دیا اور انھیں استحصال، استحصالی قوتوں اور سامراج کے خلاف آواز اٹھانے کا حوصلہ دیا۔ اس

طرح عوام میں پہلی بار واضح طور پر طبقاتی شعور پیدا کیا۔ ترقی پسند ادبی تحریک نے زندگی کی بہتر خطوط پر تشکیل کی نوید دی اور عوامی جدوجہد کا احساس پیدا کیا۔ اجتماعیت کے تصور کو ابھارا اور بتایا کہ استحصالی قوتیں ہی انسانی معاشرے میں عوام کی جہالت، بیماری، پسماندگی اور ناداری کی ذمہ داری ہیں۔ ادب کو سماجی انقلاب کا ہتھیار ٹھہرایا۔ رومانیت کے ساتھ ساتھ سماجیت کے عنصر کو ابھارا۔ ترقی پسند حقیقت نگاری، روشن خیال، خرد افروزی کو فروغ دیا۔ مصنف کے تخیل کو ارضی رشتوں کا پابند کیا، جمہوری اقدار کا تحفظ کیا، انسانی معاشرے میں محنت کش عام اور استحصالی قوتوں کے درمیان ہر لمحہ جاری جنگ کو خیر وشر کی جنگ کی قرار دیا، اسے ذہنوں میں اجاگر کیا اور محنت کش عوام کو تاریخ کا معمار بتایا۔ سب سے بڑھ کر ترقی پسند ادبی تحریک نے یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ اس نے ادبی تنقید کو سائنسی بنیادوں پر استوار کیا اور اسے نئے سماجی تصورات اور نظریات سے آشنا کیا۔

تمام جدید ادب انہی مقاصد کے پیش نظر تخلیق کیا گیا۔ ایک متعین کردہ مقصد کے تحت ادب تخلیق کیے جانے کے باعث اس میں نہ صرف جان پیدا ہوئی بلکہ اسے عوام کی آواز بنانے اور عام آدمی کی سطح تک پہنچانے کے لیے عوامی رنگ بھی اختیار کیا گیا۔ ناول، افسانہ، شاعری اور دیگر اصناف ادب فنی سطح پر نئے تجربات سے گزریں، جس کے باعث ان اصناف میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی۔ ادب جہاں عام آدمی کا نمائندہ اور ترجمان بنا، وہیں اسے ایک وافر گراں قدر ادبی سرمایہ بھی میسر آیا۔ ترقی پسند مصنفین نے تقریباً تمام اصناف میں ایسے کارنامے سرانجام دیے جنھوں نے اردو ادب کو اس سطح پر لاکھڑا کیا کہ وہ عالمی ادب کے ساتھ نظریں ملا سکے۔

ذیل مختلف اصناف میں ہونے والے تجربات کا مختصر تذکرہ درج ہے۔

افسانہ: بلاشبہ پریم چند ترقی پسند تحریک کے اولین نمائندہ افسانہ نگار تھے اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر "پریم چند کے فنی شعور، زاویہ نگاہ اور تخلیقات میں وہ تمام خصوصیات ہیں جن سے ترقی پسند عبارت ہے"...... پریم چند اس سے قبل ہی افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" ۱۹۰۹ء میں انگریز سرکار کے ہاتھوں نذر آتش کروا چکے تھے۔ گویا ادبی مقاصد اور فنی لائحہ عمل ان کے ذہن میں پہلے ہی

متعین ہو چکے تھے۔ چھپن سالہ زندگی میں سوا دو سو کے قریب افسانے لکھے، تیرہ ناول بھی تخلیق کیے، جن میں چوگان ہستی، بازار حسن، بیوہ، گوشہ عافیت، میدان عمل اور گئودان بہت مشہور ہوئے۔ پریم چند کے ہاں وطن دوستی، انسان پرستی، سماجی اصلاح، معاشی مساوات اور مذہب سے بلند وسیع المشربی افسانوں کے موضوعات میں بنیادی عقائد کے طور پر ملتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جدید افسانہ نگاری کے فن کی ابتدا بھی ان سے ہی ہوتی ہے۔ ان کے بعد آنے والے افسانہ نگار بھی ان کی سوچ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ایسے ادیبوں کی ایک کھیپ نظر آتی ہے جن کے موضوعات کا تنوع، تکنیک کے تجربات، اسلوب میں جدت اردو افسانہ کا سرمایہ ہیں۔ ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، میرزا ادیب، خواجہ احمد عباس، غلام عباس، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ اور خدیجہ مستور کے نام اہم سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ادیبوں نے بھوک افلاس سے ہٹ کر شہری اور دیہی زندگی کے تفاوت سے جنم لینے والے المیوں سے لے کر جنس نگاری تک کو اپنا موضوع بنایا۔ اور افسانے کو انسانی تحلیل نفسی کا ذریعہ بھی! بقول ڈاکٹر سلیم اختر: "افسانہ نگاروں کی یہ فہرست نامکمل ہے اور ان میں سے چند پر تبصرہ مجمل اور قطعی طور پر ناکافی ہے لیکن اس سے ترقی پسند افسانہ کے موضوعات میں تنوع اور ہمہ گیری کا اندازہ یقیناً ہو سکتا ہے"۔

ناول: گو کہ مقدار میں افسانہ کے مقابلے میں ترقی پسندوں نے ناول کو کم البتہ معیار کے حوالے سے گرانقدر سرمائے سے نوازا۔ کرشن چندر کا شکست، عصمت کا ٹیڑھی لکیر، عزیز احمد کے گریز اور شبنم کے علاوہ پریم چند کے بعض ناول بھی اس سلسلے کی کڑی ہیں۔ ترقی پسندوں کا ناول کی طرف دھیان نہ ہونے کا ایک سبب اس کے موضوعات کا تنوع اور وسیع کینوس ہو سکتا ہے چونکہ انھوں نے فقط ایک نظریے کا پرچار کرنا تھا اور بھوک و افلاس اہم موضوعات ہوتے ہوئے بھی کینوس کے حوالے سے اس قدر وسیع نہ تھے جتنی وسعت اور گہرائی کا متقاضی ناول ہوتا ہے، البتہ غیر ملکی اور خصوصاً روسی ناولوں کے تراجم سے اردو ادب کا دامن ضرور مالا مال کیا گیا۔

**خاکہ نگاری:** خاکہ نگاری کی صنف گوکہ دیگر اصناف کی طرح اردو میں بہت پہلے سے رائج تھی لیکن اردو میں لکھے گئے شخصی خاکے اور رپوتاژ شخصیات سے ذاتی عقیدت کی بنا پر تعریف وتوضیح سے آگے نہ بڑھ سکے تھے۔ترقی پسند ادیبوں نے اس صنف کا اسلوب اور طرز ہی بدل دیا۔ پہلی مرتبہ شخصیت کی انسانی خوبیوں سمیت خامیوں کو بھی فنکارانہ بصیرت سے اجاگر کیا گیا اور یوں خاکہ نگاری قصیدہ خوانی کے گرداب سے نکل کر حقیقت نگاری سے آشنا ہوئی۔اس سلسلے میں عصمت کا ان کے بھائی اور نامور ادیب عظیم بیگ چغتائی کے متعلق لکھا گیا خاکہ "دوزخی" اور منٹو کے "گنجے فرشتے" خاصے مقبول ہوئے۔احمد بشیر نے بھی بعض بہت اچھے خاکے لکھے لیکن تواتر سے نہ لکھنے کے باعث وہ شہرت حاصل نہ کر سکے جس کے وہ حقدار تھے۔

اسی طرح رپوتاژ کو مقبول بنانے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، ابراہیم جلیس، سجاد ظہیر وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔فسادات اور تقسیم ملک کے موضوع پر بھی بعض بہت اچھے رپوتاژ لکھے گئے، جنھوں نے خاکہ نگاری کے ساتھ رپوتاژ کے فن اور اسلوب کو بھی نئی زندگی بخشی۔

**شاعری:** ترقی پسند ادیبوں نے افسانہ کے بعد سب سے زیادہ شاعری کی صنف میں اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا بلکہ افسانے سے بھی کہیں زیادہ کام شاعری میں نظر آتا ہے۔غزل اور نظم میں ہیئت کے نئے تجربے ہوئے۔آزاد نظم کو خصوصی طور پر اسی زمانے میں فروغ ملا۔غزل کے بنیادی فنی 'لوازمات' کے باعث اس جانب ذرا کم توجہ دی گئی لیکن ایسے بھی شعرا تھے، جنھوں نے غزل میں بھی انقلابی موضوع کے شعر لکھ کر غزل کی ہیئت اور اس کی تشریح ہی بدل دی۔اسی طرح معریٰ نظم کو خاص فروغ ملا نظم کیونکہ غزل کی نسبت ایک ہی خیال سے منسلک ہوتی ہے، اس لیے ترقی پسند ادیبوں کو نظم میں اظہار خیال کرنے میں زیادہ آسانی محسوس ہوئی۔

نظم میں سب سے زیادہ نام فیض، کیفی، ساحر اور احمد ندیم قاسمی نے کمایا جبکہ 'بغاوت اور انقلاب' کے الفاظ ہمیں جوش کے ہاں زیادہ ملتے ہیں، اسی سبب انھیں "شاعر انقلاب" کہا جاتا ہے۔ان کے ہم عصروں میں حسرت موہانی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، احسان دانش، مجاز علی، سردار

جعفری، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور دیگر کئی نام ملتے ہیں۔ ان میں حسرت، فراق، مجروح، کیفی اور دیگر نے اسی مخصوص طرز پر بعض بہت اچھی غزلیں بھی کہیں۔

## ترقی پسند تحریک کی کامیابیاں

ترقی پسند تحریک سے پیشتر ادب زندگی کے مسائل سے بے پروا ہو گیا تھا۔ شعروں اور افسانوں میں ایسی جذباتی اور مافوق الفطرت باتیں کی جاتی تھیں جن کا عام آدمی کی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب کو زندگی کے مسائل سے ہم آہنگ کیا اور ادب کو مادی حقائق کے قریب تر لانے کی کوشش کی اور ادب کو عام آدمی کی زندگی کے روزمرہ کے مسائل اور اردگرد کے ماحول کا نمائندہ بنا دیا، جس کے باعث ادب خواص سے نکل کر عوام تک پہنچا عام آدمی کی بھی ادب تک رسائی ہوئی اور وہ بھی ادب کو پڑھنے سمجھنے اور اس میں دلچسپی لینے لگے۔

ترقی پسند مصنفین نے اردو ادب میں نئی اصناف اور نئی ہیئتیں رائج کر کے فنی خزانے میں گراں قدر اضافے کیے۔ شاعری میں پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی روایات پیدا کیں۔ اور ایسی بے مثال روایات کہ جس کی بے پناہ تقلید کی گئی۔ ترقی پسند تحریک سے قبل نظموں کا رواج کم تھا، غزل گوئی ہی شاعری کا جداامجد تھی۔ ترقی پسندوں نے چونکہ نظریہ پیش کرنا ہوتا تھا، جس کے لیے غزل کی نسبت نظم زیادہ موزوں تھی۔ اس لیے یہ دور نظم کے عروج کا دور تھا۔ ترقی پسند شعرا نے بیش بہا نظموں کا خزانہ اردو ادب کو دیا جب کہ اکثر پرانی علامتوں کو بھی نئی زندگی دے دی۔ انہوں نے ادبی اور بول چال کی زبان کی خلیج کو کم کر کے سادہ اور آسان بنا دیا۔ بہت سے نئے الفاظ کو ادبی زبان کا حصہ بنایا۔ زندگی اور سماج کی نئی حقیقتوں سے تشبیہ اور استعارے حاصل کر کے اردو کے ادبی اور فنی خزانے میں اضافہ کیا اور زبان میں بیان اور اظہار کے نئے پیرائے تخلیق کیے۔

آسان زبان کے استعمال ہی کے باعث انہیں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ میسر آیا اور اس حلقے میں بھی کثیر تعداد مزدوروں کسانوں اور نچلے طبقے کے کم تعلیم یافتہ لوگوں کی تھی۔ اس سلسلے میں علی سردار جعفری اپنی کتاب...... "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں: "ترقی پسند مصنفین کے

سامعین اور قارئین کو کئی گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: ان کے قارئین کی ایک بڑی تعداد مزدوروں کی ہے، وہ کلاسیکی ادب کی روایات سے زیادہ واقف نہیں ہیں، وہ اس ادب سے سب سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں جس میں ان کے دکھ درد ان کی تمنائیں ان کے خواب ہوں وہ اپنے ادیبوں سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اور ان کے ایک ایک لفظ سے متاثر ہوتے ہیں"۔ (ص:۳۶)

ترقی پسند مصنفین نے نئی علمی تنقید کو مروج کیا جس کی بنیاد اس پر رکھی گئی کہ ادب کا جائزہ سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لیا جائے۔ اس سے فکری تنقید کی سطح بلند ہوئی اور یوں تنقید کا فن بھی سائنس تصور کیا جانے لگا۔

مجموعی طور پر ترقی پسند ادیبوں نے سیاسی اور سماجی زندگی کے اتنے پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے کہ ان کی تخلیقات کے مجموعے سے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے تمام پہلوؤں کی ایک مکمل تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

جمیل انجم اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک" میں اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اس تحریک کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ادب کے فرسودہ ڈھانچے کو توڑ دیا اور اس جھوٹے تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد محض تفریحِ طبع ہے جو مٹھی بھر آدمیوں کی لطف اندوزی کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے، اس اصول کی تبلیغ کی اور اسے منوالیا کہ ادب عوام کا ترجمان ہوتا ہے"۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کی حاصلات کو اگر مربوط انداز میں بیان کیا جائے، تو چند نقاط کی صورت کچھ یوں ہوں گی:

۱......ترقی پسند تحریک نے ادب کے فرسودہ ساختی ڈھانچے کو توڑ دیا اور اس جھوٹے تصور کو ختم کر دیا کہ ادب کا مقصد محض تفریح ہے جو مٹھی بھر پیٹ بھرے آدمیوں کی لطف اندوزی کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے۔

۲......اس ادب نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوم درمیانی طبقے کی زندگی اور مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور حقیقت نگاری کی بنیادیں استوار کیں۔

۳......اس نے عقل پسندی کو مذہبی تصورات سے، حبِ وطن کو ماضی پرستی سے، آزادی

کے تصور کو طبقاتی کوڑھ سے اور سامراج دشمنی کو سمجھوتے بازی کی آلائشوں سے پاک کیا اور ایسے ادب کی تخلیق کی جس کا بہترین جوہر طبقاتی شعور اور عوام دوستی ہے۔

۴......اس نے سامراجی اور جاگیرداری عناصر کی مخالفت کی اور ان قدروں کو نفرت و حقارت سے ٹھکرایا جو ان کے مکتبِ خیال سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کے مقابلے میں اعلیٰ درجے کی انسانی قدریں پیش کیں۔

۵......اس نے ادب کے ذریعے اس غیر منصفانہ سماج کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور انقلاب کو دعوت دی۔ حالانکہ ابتدا میں بعض ترقی پسند ادیبوں کا تصور جذباتی اور روحانی تھا، وہ طبقات کی کشمکش اور اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھتے تھے۔ پھر بھی یہ اتنی بڑی سچائی تھی کہ انقلاب کا نعرہ اردو ادب پر چھا گیا۔

۶......اس نے اردو ادب میں طبقاتی شعور بیدار کیا اور ایک غیر جانب دار طبقاتی انسانی سماج کا خواب دیکھا، قومیت کے تنگ دائرے سے نکل کر بین الاقوامیت کے تصور کو فروغ دیا اور دنیا کے ہر گوشے کی آزادی کی تصویر دیکھی۔ اس نے ادیبوں کے نقطۂ نظر میں اتنی وسعت اور تخیل میں ایسی بلندی پیدا کر دی جس سے اردو ادب پہلے واقف نہ تھا۔

۷......اس نے اردو ادب کو ادب نواز حلقوں کے چھوٹے سے دائرے سے باہر نکال کر عوام کے وسیع حلقوں میں پہنچا دیا۔

۸......ترقی پسند مصنفین نے ادبی اور بول چال کی زبان کی خلیج کو کم کر کے زبان کو سادہ اور آسان بنا دیا۔ محض روایتی اور فرسودہ اندازِ بیان کو ترک کر کے سیدھا سادہ، نیا اور شگفتہ اندازِ بیان اختیار کیا۔ بہت سے نئے الفاظ کو ادبی زبان میں داخل کر دیا اور زندگی اور سماج کی نئی حقیقتوں سے تشبیہ اور استعارے حاصل کر کے اردو کے ادبی اور فنی خزانے میں اضافہ کیا۔ اور زبان میں اظہار کے نئے امکانات پیدا کیے۔

۹......اردو ادب میں نئی اصناف اور نئی ہیئتیں رائج کر کے فنی خزانے میں اضافے کیے گئے۔ شاعری میں پرانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی روایات پیدا کی گئیں۔ آزاد نظم، اور نظمِ

معریٰ کو رواج دے کر اردو شاعری کو وسعت عطا کی گئی۔ غزل کو سماجی تصور اور عوامی جدوجہد کا موضوع عطا کر کے وسعت دی، نثر میں رپورتاژ کی صنف کو رائج کیا، افسانے کے موضوع کو وسعت اور تکنیک کو ترقی دی۔

۱۰......نئی قسم کی علمی تنقید پیدا کی۔ جس کی بنیاد یہ تھی کہ ادب کا جائزہ سامراجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں لیا جائے۔ تنقید کی سطح کو بلند کیا، اور تنقید کے فن کو سائنس بنا دیا۔ یہ تنقیدی انداز اردو ادب میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان نقاط کی روشنی میں ترقی پسند تحریک کے دائرہ عمل اور ادب پر اس کے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تحریک بڑی توانا اور طاقت ور تحریک تھی، جس نے ان ذہنی رویوں کو بدلنے کی کوشش کی جو اس سے پیشتر رواج پذیر تھے۔ اور یہ بات تو واضح ہے کہ اس تحریک نے ادب میں بے پناہ وسعت پیدا کر کے اس کی حدوں کو پھیلا دیا اور اس میں وہ تنوع اور گہرائی پیدا ہو گئی جو اس سے پہلے ادب میں اس انداز میں موجود نہ تھی۔

## ترقی پسند تحریک پر تنقید

ترقی پسند تحریک پر بعض الزامات بھی عائد کیے گئے، جن میں سب سے بڑا الزام ان پر پروپیگنڈے کا ہے کیونکہ ترقی پسند ادیب کھلم کھلا اور برملا یہ کہتے ہیں کہ ادب کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد سماج کو بہتر بنانے کا ہوتا ہے، اس لیے نام ور ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے ان پر سخت اعتراضات بھی کیے گئے۔

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ: ''جن اصولوں پر ترقی پسند تحریک کی بنیاد ہے وہ غلط ہیں؛ عموماً ترقی پسند ادب میں ادبی محاسن مفقود ہیں۔ یہ ادب، ادب نہیں بلکہ کوئی اور چیز ہے''۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے جذبات کے بہاؤ میں آ کر فن پر مقصد کو زیادہ اہمیت دی فکر کی جگہ خیال نے لے لی۔ جس کے باعث ہیئت پرست اور رجعت پسند طبقوں نے ان کی تخلیق کردہ اکثر تخلیقات کو ادب ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

اعتراض کا ایک نقطہ یہ بھی تھا کہ ترقی پسند مصنفوں کو غور وفکر کی عادت نہیں، ان کے خیالات چونکہ ماخوذ ہیں اور موضوعات بندھے ٹکے ہیں، اس لیے انھیں زیادہ غور وخوض کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور مقصد اور خیال کی اہمیت کے پیش نظر وہ لفظوں کے انتخاب کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ہاں منفرد اسلوب نہیں پایا جاتا، ہر ترقی پسند ادیب ایک ہی لہجے میں ایک بات کہے جا رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے ایسے نامور ادیب اور دانش ور جو ابتدا میں تحریک کے حامی و ہم نوا رہے تھے، بعد میں نہ صرف تحریک سے الگ ہو گئے بلکہ سرعام اس کی سخت مخالفت کرنے لگے۔ انھی میں ایک اہم نام بابائے اردو مولوی عبدالحق کا بھی ہے جو نہ صرف انجمن کے پہلے اعلان نامے میں شامل رہے بلکہ ۱۰ جولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں انجمن کی دوسری سالانہ کانفرنس کی صدارت بھی کی۔ واضح رہے کہ اسی کانفرنس میں انجمن کا مجوزہ آئین تیار کیا گیا اور دو دن بعد مجید سالک اور بابائے اردو نے اپنی تقریروں میں واضح الفاظ میں کہا کہ، "ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات پر پاکستان کو فخر ہے"۔

لیکن ترقی پسندوں کے فنی اور فکری سطح سے ہٹ جانے کے باعث یہی بابائے اردو مولوی عبدالحق بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ...... "میں دیکھتا ہوں کہ اکثر ترقی پسند نوجوان اپنے خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، جو دل میں ہے وہ بیان میں نہیں آتا...... لکھنے والوں میں بہت کم ایسے ہیں جو الفاظ کے صحیح استعمال سے واقف ہیں"۔

ناقدین کے بقول دوسری طرف دیکھا جائے تو ایک مخصوص نظریے کے باعث سارا ترقی پسند ادب یکسانیت کا شکار نظر آتا ہے۔ اس دوران ادب کے موضوعات بندھے ٹکے اور محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ کئی شعرا کی نظمیں ایسی ہیں کہ اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سی نظم کس کی ہے؟ یہی حال نثر میں بھی ہے!

دوسری جانب اس تنقید کا جواب دینے اور اپنے نظریہ کا دفاع کرنے والوں نے ان الزامات کو رد کیا، اور اس کے ضمن میں اپنے دلائل فراہم کیے۔ ترقی پسند تحریک کے بانی رہنماؤں میں سے ایک، سجاد ظہیر اپنی کتاب "روشنائی" میں اس بابت لکھتے ہیں: "ترقی پسند، فن کار کی آزادی کے

مخالف نہیں ہیں۔ وہ بہترین فنی تخلیق کے لیے آزاد اور پاکیزہ اور صحت مند فضا کے متمنی ہیں اور اسے قائم کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ بہت تلخی کے ساتھ اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ خود ہمارے ملک میں دانش ور اور فن کار آزاد نہیں ہیں۔ معاشی اور سیاسی دباؤ اور سماج کے رجعت پرست حلقوں کی طرف سے کبھی کھلی اور کبھی ڈھکی ہوئی زبردستیاں اور مکروہ سازشیں، ان کی آزادی خیال اور آزادی تخلیق کی راہ میں کوہ گراں کی طرح حائل ہیں۔ البتہ ترقی پسند، فن کار کو فہم اور شعور سے آزاد کردینے کے قائل نہیں ہیں۔ دراصل یہ ممکن ہی نہیں ہے اور جو لوگ اس کا مطالبہ کرتے ہیں ان کا منشا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خود ان کے پست، الجھے ہوئے، انسانیت سے گریزاں اور نفس کش خیالات کو تو فن کے مقدس اور حسین نام پر اظہار کی پوری آزادی ملے اور ترقی پسند، اور روح پرور دل کشا انسانیت کا سوز رکھنے والے تصورات اور جذبات کو، جو ہر اچھے اور بڑے فن کار کی جان ہوتے ہیں، پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

ترقی پسند تحریک کے مخالفین کی جانب سے ایک اور بڑا الزام یہ رہا کہ اس میں شمولیت کے لیے اشتراکی ہونا ضروری ہے۔ اس الزام کا دفاع ترقی پسندوں کے فکری حمایتی ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے ایک مضمون، "ترقی پسند تحریک: ایک تنقیدی جائزہ" میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہونے کے لیے کبھی بھی کمیونسٹ ہونے کی ضرورت نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے، آئندہ بھی نہیں ہوگی۔ اس میں ہر سیاسی خیال کے لوگ شامل ہوسکتے ہیں۔ البتہ اس میں شریک ہونے کے لیے چند بنیادی باتوں پر ان کا متفق ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ انسانیت کی قدروں کو آگے بڑھانے میں مدد کریں گے۔ جبر و استبداد کی مخالفت ان کا فرض ہوگا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی زندگی میں جو افراتفری مچا رکھی ہے، جو ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، اس کو کو فنا کرنا ان کے نزدیک از بس ضروری ہے۔ آزادی تحریر و تقریر انسان کا بنیادی حق ہے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر حکومت اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے ادب، تہذیب، کلچر و سماج کی چھاتی پہ مونگ دلتی ہے تو ان کا فرض ہے کہ ایسی حکومت کی مخالفت کریں۔ دنیا میں جو سرمایہ دارانہ قوتیں اپنے جال پھیلا کر عوامی اور انسان دوست طاقتوں کو اس میں اسیر کرنا چاہتی ہیں، ان کے

خلاف آواز اٹھانا ترقی پسند ادیبوں کے نزدیک لازمی ہے۔ وہ اپنے ملک میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کے مظاہرے نہیں چاہتے۔ وہ صحیح معنوں میں عوام کی حکومت کے خواہاں ہیں۔ عوام کا معیارزندگی بلند کرنا،ان کے پیش نظر ہے۔"

## اجمالی جائزہ

ترقی پسند تحریک مجموعی طور پر اپنے اثرات اردو ادب پر مرتب کرنے کے بعد ۵۰ء کی دہائی میں مفقود ہونا شروع ہوگئی۔ گو کہ اس کا تسلسل کسی نہ کسی صورت آج بھی موجود ہے، لیکن تحریک حقیقی معنوں میں اپنا اثر کھو چکی ہے۔

اس عظیم الشان تحریک کی ناکامی کا ایک بڑا سبب اس میں براہ راست سیاسی مقاصد کا درآنا تھا، جس کے باعث ادیب گروہوں میں بٹ گئے اور ان کی انتہا پسندی ان میں فاصلوں کا سبب بنی۔ ترقی پسند مصنفین نظریاتی حوالے سے اشتراکیت کے حامی تھے اور یوں اشتراکی مقاصد ہی ادبی مقاصد قرار پائے۔ بعدازاں کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ان کے روابط کے الزام میں بعض ادیب جیل بھی گئے اور سزائیں بھی کاٹیں۔

گو کہ سجاد ظہیر نے اپنے مضمون ادبی "روایات اور ترقی پسند ادب" میں ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے لکھا کہ "ترقی پسند ادیبوں کی انجمن سیاسی پارٹی نہیں ہے، وہ ادب کی تخلیق اور ترقی پسند خیالات اور نظریات کی ترویج کا ایک تہذیبی ادارہ ہے۔ اس کے ہرگز یہ معانی نہیں ہیں کہ ادیب سیاسی امور پر کوئی رائے نہ رکھیں یا اپنی انجمن کے ذریعے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار نہ کریں"۔

لیکن اس کے باوجود تحریک مزید پنپ نہ سکی اور اس کا جواز ڈاکٹر کریم الدین احمد اپنے مضمون "ترقی پسند تحریک کا ایک جائزہ" میں یوں بیان کرتے ہیں ...... "ادیب کو ہر دور میں دو دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے؛ خوف اور لالچ۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ترقی پسند تحریک ان دونوں دشمنوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اس کی اصل وجہ اس کا اپنا ڈھیلا ڈھالا تنظیمی ڈھانچہ تھا۔ اگر ترقی پسند ادیب

صحیح اشتراکی شعور رکھتے تو تنظیم اتنی آسانی سے ختم نہ ہو جاتی"۔

دوسری جانب، تنظیم کے خاتمے سے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال یہ ہے کہ: "ترقی پسند مصنفین کی ادبی اہمیت ختم نہیں ہوتی، گو آج اس ملک میں تحریک باضابطہ طور سے ختم کی جا چکی ہے لیکن اس کے اثرات و ثمرات سے انکار، تاریخ کے ایک اہم باب کو ختم کر دینے کے مترادف ہے"۔

## حصہ چہارم

# اُردو کی ترقی میں مشہور ادارے

maablib.org

# اُردو کی ترقی میں مشہور ادارے

## فورٹ ولیم کالج

فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ اردو نثر کی تاریخ میں خصوصاً یہ کالج سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگرچہ کالج انگریزوں کی سیاسی مصلحتوں کے تحت عمل میں آیا تھا۔ تاہم اس کالج نے اردو زبان کے نثری ادب کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھول دیں تھیں۔ سرزمین پاک و ہند میں فورٹ ولیم کالج مغربی طرز کا پہلا تعلیمی ادارہ تھا جو لارڈ ولزلی کے حکم پر ۱۸۰۰ء میں قائم کیا گیا تھا۔

اس کالج کا پس منظر یہ ہے ۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا تو یہاں کے نظم ونسق کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ انگلستان سے جو نئے ملازمین کمپنی کے مختلف شعبوں میں کام کرنے یہاں آتے ہیں، وہ کسی منظم اور باقاعدہ تربیت کے بغیر اچھے کارکن نہیں بن سکتے۔ لارڈ ولزلی کے نزدیک ان ملازمین کی تربیت کے دو پہلو تھے: ایک ان نوجوان ملازمین کی علمی قابلیت میں اضافہ کرنا اور دوسرا ان کو ہندوستانیوں کے مزاج اور ان کی زندگی کے مختلف شعبوں ان کی زبان اور اطوار طریقوں سے واقفیت دلانا۔

پہلے زبان سیکھنے کے لیے افسروں کو الاؤنس دیا جاتا تھا، لیکن اس سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے تھے۔ اس لیے جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر آئے تو انھوں نے یہ ضروری سمجھا

کہ انگریزوں کو اگر یہاں حکومت کرنی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ کمپنی کے ملازمین کا مقامی زبانوں اور ماحول سے آگاہی کے لیے تعلیم و تربیت کا باقاعدہ انتظام کیا جائے۔ ان وجوہات کی بنا پر ولزلی نے کمپنی کے سامنے ایک کالج کی تجویز پیش کی۔ کمپنی کے کئی عہداروں اور پادریوں نے اس کی حمایت کی۔

اور اس طرح جان گلکرسٹ جو کہ ہندوستانی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین کو روزانہ درس دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور لارڈ ولزلی نے یہ حکم جاری کیا کہ آئندہ کسی سول انگریز ملازم کو اس وقت تک بنگال، اڑیسہ اور بنارس میں اہم عہدوں پر مقرر نہیں کیا جائے گا، جب تک وہ قوانین و ضوابط کا اور مقامی زبان کا امتحان نہ پاس کر لے۔ اس فیصلے کے بعد گلکرسٹ کی سربراہی میں ایک جنوری ۱۷۹۹ء میں ایک مدرسہ Oriental Seminary قائم کیا گیا۔ جو بعد میں فورٹ ولیم کالج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ کچھ مسائل کی وجہ سے اس مدرسے سے بھی نتائج برآمد نہ ہوئے، جن کی توقع تھی۔ جس کے بعد لارڈ ولزلی نے کالج کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا۔

## کالج کا قیام

لارڈ ولزلی نے کمپنی کے اعلیٰ حکام سے منظوری حاصل کر کے ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام کا اعلان کیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کالج کا یوم تاسیس ۲۳ مئی ۱۸۰۰ء تصور کیا جائے، کیوں کہ یہ دن سلطان ٹیپو شہید کے دارالحکومت سرنگا پٹم کے سقوط کی پہلی سال گرہ کا دن تھا۔ جب کہ کالج میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ ۲۳ نومبر ۱۸۰۰ء کو یعنی کالج کے قیام کے اعلان کے کوئی چھ ماہ بعد شروع ہوا۔ کالج کے قواعد و ضوابط بنائے گئے۔ اس کے علاوہ گورنر کو کالج کا سرپرست قرار دیا گیا۔ کالج کا سب سے بڑا افسر پروسٹ کہلاتا تھا۔ پروسٹ کا برطانوی کلیسا کا پادری ہونا لازمی قرار دیا گیا۔

## نصابِ تعلیم

فورٹ ولیم کالج کے ریگولیشن کے تحت کالج میں اردو (ہندوستانی) عربی، فارسی، سنسکرت، مرہٹی اور کنڑی زبانوں کے شعبے قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ اسلامی فقہ، ہندو دھرم، اخلاقیات، اصول قانون، برطانوی قانون، معاشیات، جغرافیہ، ریاضی، یورپ کی جدید زبانیں، انگریزی ادبیات، جدید وقدیم تاریخ ہندوستان دکن کی قدیم تاریخ۔ طبیعیات، کیمسٹری اور علوم نجوم وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کالج میں مشرقی زبانوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اس لیے السنہ شرقیہ کے شعبوں میں انگریز پادریوں کے علاوہ پروفیسروں کی مدد کے لیے شعبے میں منشی اور پنڈت بھی مقرر کیے گئے تھے۔ ہندوستانی زبان کے شعبے میں پہلے بارہ منشی مقرر ہوئے، جسے بعد میں بڑھا کر ۲۵ کر دیا گیا۔

## فورٹ ولیم کالج کے مصنفین

فورٹ ولیم کالج صرف ایک تعلیمی ادارہ نہ تھا بلکہ یہ کالج اس زمانے میں تصنیف وتالیف کا بھی بڑا مرکز تھا۔ اس کالج کے اساتذہ اور منشی صاحبان طلبا کو پڑھانے کے علاوہ کتابیں بھی لکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس کالج میں لغت، تاریخ، اخلاق، مذہبی، اور قصوں کہانیوں کی کتابیں بڑی تعدا د میں لکھی گئیں۔ مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے منظور شدہ کتابوں پر انعام بھی دیا جاتا تھا۔ کالج کے قیام کے ابتدائی چار برسوں میں ۲۳ کتابیں لکھی گئیں۔

ذیل میں بعض مشہور اہم مصنفین اور ان کی تصانیف کا ذکر اختصار کے ساتھ درج ہے۔

**جان گلکرسٹ:** فورٹ ولیم کالج کے شعبہ ہندوستانی کے مصنفین میں سے سرفہرست ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا نام ہے۔ وہ ۱۷۵۹ء کو ایڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں پیدا ہوئے۔ وہ بطور ڈاکٹر ہندوستان آئے۔ اور یہاں کی زبان سیکھی، کیوں کہ اس کے بغیر وہ یہاں اپنے پیشے کو بخوبی سرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج کے آغاز کا سبب بنے۔ جان گلکرسٹ نے

چار سال تک اس کالج میں خدمات سر انجام دیں اور ۱۸۰۴ء میں وہ وظیفہ یاب ہو کر انگلستان چلے گئے۔ جہاں اورنٹیل انسٹی ٹیوٹ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے، ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو پیرس میں انتقال کر گئے۔

تصنیفات و تالیفات: فورٹ ولیم کالج میں چار سالہ قیام کے دوران انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں۔

''انگریزی ہندوستانی لغت'' ان کی پہلی تصنیف ہے۔ اس لغت میں انگریزی الفاظ کے معانی اردو رسم الخط میں شامل کیے گئے ہیں۔ اور اس میں اس طرح کے اشاروں کا اضافہ کیا گیا ہے، جن سے پڑھنے والوں کو الفاظ کے تلفظ میں زیادہ سے زیادہ سہولت ہو۔ لغت میں معنی سمجھانے کے لیے اردو ہندی اشعار رومن میں درج کیے گئے ہیں۔

''ہندوستانی زبان کے قواعد'' ان کی دوسری تصنیف ہے۔ یہ اردو کی صرف و نحو کی بہترین کتاب ہے۔ بہادر علی حسینی نے رسالہ گلکرسٹ کے نام سے اس کتاب کا خلاصہ مرتب کیا۔

بیاضِ ہندی میں فورٹ ولیم کالج کے مصنفین و مولفین کے کلام و نثر کا انتخاب شامل ہے۔ مشرقی قصے میں حکایتوں اور کہانیوں کا ترجمہ شامل ہے، جو حکایاتِ لقمان اور انگریزی، فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت کے واسطے مترجم تک پہنچی ہیں۔ ان کے علاوہ گلکرسٹ کی تصانیف میں مشرقی زبان دان، فارسی افعال کا نظریہ جدید، رہنمائے اردو، اتالیق ہندی، عملی خاکے، ہندی عربی آئینہ، ہندوی داستان گو اور ہندوستانی بول چال وغیرہ شامل ہیں۔

میر امن: میر امن کا اصل نام میر محمد امان اور تخلص امن تھا۔ آپ نے باقاعدہ شاعری کبھی نہیں کی۔ میر امن کے بزرگ، ہمایوں کے عہد میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہوئے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔ مغلوں کے دور آخر میں جب دلی کو احمد شاہ ابدالی نے تاراج کیا اور سورج مل جاٹ نے لوٹا تو میر امن دلی کو خیر آباد کہہ کر عظیم آباد پہنچے۔ وہاں سے کلکتہ گئے کچھ دن بے کاری میں گزرے۔ بالآخر میر بہادر علی حسینی نے ان کا تعارف فورٹ ولیم کالج کے

شعبہ ہندوستانی کے سربراہ ڈاکٹر گل کرائسٹ سے کرایا۔ انھوں نے میر امن کو کالج میں ملازم رکھ لیا۔ اور قصہ چہار درویش (فارسی) سلیس نثر میں لکھنے پر مامور کیا۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں باغ و بہار لکھنی شروع کی۔ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی اور ۱۸۰۳ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ میر امن کی دوسری کتاب "گنج خوبی" ہے۔ جو ملا حسین واعظ کاشفی کی "اخلاقِ محسنی" کا ترجمہ ہے۔

میر امن کی زندگی کے حالات کسی کتاب یا تذکرہ میں نہیں ملتے، لہٰذا ان کی ولادت اور وفات کے بارے میں کسی کو صحت کے ساتھ معلوم نہیں۔

**سید حیدر بخش حیدری:** حیدری کی ولادت کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سے میر امن کے بعد جس مصنف کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، وہ سید حیدر بخش حیدری ہیں۔ دہلی کی بربادی کے زمانے میں حیدری کے والد دہلی سے بنارس چلے گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے لیے ہندوستانی منشیوں کا سن کر حیدری ملازمت کے لیے کلکتہ گئے۔ ڈاکٹر گلکرسٹ تک رسائی کے لیے ایک "قصہ مہر و ماہ" بھی ساتھ لکھ کر گئے۔ گلکرسٹ نے کہانی کو پسند کیا اور اُن کو کالج میں بطور منشی مقرر کیا۔ وہ بارہ برس تک کالج سے منسلک رہے۔ ۱۸۲۳ء میں بنارس میں انتقال کر گئے۔

فورٹ ولیم کالج کے تمام مصنفین میں سے سب سے زیادہ کتابیں لکھنے والے سید حیدر بخش حیدری ہیں۔ ان کی تصانیف کی تعداد دس کے قریب ہے جن میں شامل ہیں:

(۱) قصہ مہر و ماہ (۲) قصہ لیلیٰ مجنوں (۳) ہفت پیکر (۴) تاریخ نادری (۵) گلزار دانش
(۶) گلدستہ حیدری (۷) گلشن ہند (۸) توتا کہانی (۹) آرائش محفل

لیکن حیدری کی شہرت کا سبب اُن کی دو کتابیں "توتا کہانی" اور "آرائش محفل" ہیں۔ یہ دونوں کتابیں داستان کی کتابیں ہیں جو کہ جان گلکرسٹ کی فرمائش پر لکھی گئیں۔

"طوطا کہانی" جس طرح کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب مختلف کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے، جس کی سب کہانیاں ایک طوطے کی زبانی بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں ۳۵

کہانیاں ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کی عدم موجودگی میں اپنے محبوب سے ملنے جانا چاہتی ہے۔ طوطا ہر روز اس کو ایک کہانی سنانا شروع کر دیتا ہے اور ہر روز باتوں باتوں میں صبح کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنے محبوب سے ملنے نہیں جا سکتی حتیٰ کہ اس دوران اس کا شوہر جاتا ہے۔ جہاں تک کتاب کے اسلوب کا تعلق ہے تو سادگی کے ساتھ ساتھ حیدری نے عبارت کو رنگین بنانے کے لیے قافیہ پیمائی سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ موقع اور محل کے مطابق اشعار کا بھی استعمال کیا ہے۔ توتا کہانی کی داستانوں میں جا بجا مسلمانوں کی معاشرت اور ان کے رہنے سہنے کی بھی جھلک پیش کی ہے۔

حیدری کی دوسری کتاب ''آرائش محفل'' ہے جو اپنی داستانوی خصوصیات کی بنا پر توتا کہانی سے زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کتاب میں حیدری نے حاتم کے سات مہموں کو قصے کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اور اسے فارسی سے ترجمہ کیا۔ لیکن اپنی طبیعت کے مطابق اس میں اضافے بھی کیے ہیں۔ جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے تو زبان میں متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ساتھ سادگی اور بے تکلفی بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں ''توتا کہانی'' کی طرح جان بوجھ کر محاورات کا استعمال نہیں کیا گیا۔ داستان کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں وہ تمام لوازمات شامل ہیں جو کہ کسی داستان کا حصہ ہونے چاہئیں۔ اس لیے کتاب میں مافوق الفطرت عناصر کی فراوانی ہے۔

میر شیر علی افسوس: فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفین میں میر شیر علی افسوس کا نام بھی شامل ہے۔ میر شیر علی افسوس کے آباؤ اجداد ایران سے آکر ہندوستان میں آباد ہوئے۔ افسوس دہلی ۱۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ لیکن دہلی کی تباہی کے بعد افسوس لکھنؤ چلے گئے۔ کرنل اسکاٹ کی بدولت رٹ ولیم کالج کے منشیوں میں بھرتی ہوئے۔ 1809ء  کلکتہ میں ان کا انتقال ہوا۔

فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں میر شیر علی افسوس نے دو کتابیں تصنیف کیں: باغ اردو، رائش محفل۔ ''باغ اردو'' شیخ سعدی کی گلستان کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں سادگی کی کمی ہے۔ اس

میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ افسوس نے فارسی کے محاورے اور اسلوب کا موزوں اردو بدل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کتاب میں نہ سلاست پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی روانی اور بے تکلفی۔

ان کی دوسری کتاب ''آرائش محفل'' ہے۔ یہ کتاب سجان رائے بٹالوی کی کتاب ''خلاصۃ التواریخ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ تاریخ کی کتاب ہونے کے باجود اپنے سادہ اور پروقار اسلوب کی بنا پر ہمارے دور کے ادب کی کتابوں میں شامل ہونے لگی ہے۔ عبارت میں سلاست اور روانی اور بے تکلفی اس کتاب کا خاصہ ہے۔

**میر بہادر علی حسینی:** میر بہادر علی حسینی، فورٹ ولیم کالج کے میر منشی تھے۔ میر امن ان ہی کی وساطت سے فورٹ ولیم کالج میں بھرتی ہوئے تھے۔ ان کے حالات زندگی کے بارے میں بھی کچھ زیادہ علم نہیں۔ ان کی پیدائش اور وفات کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے والد کا نام سید عبداللہ کاظم بتایا جاتا ہے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ حسینی شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی۔ وہ کب فورٹ ولیم کالج میں بھرتی ہوئے اور کب تک منسلک رہے، اس کے بارے میں معلومات موجود نہیں۔ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں کئی کتابیں لکھیں جو کہ مندرجہ زیل ہے۔

''نثر بے نظیر'' میں میر حسن کی مشہور زمانہ مثنوی ''سحر البیان'' کی کہانی کو نثر میں بیان کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت حسینی نے وہی فضا پیش کی ہے جو کہ ''سحر البیان'' کا خاصہ ہے۔ ''اخلاق ہندی'' حسینی نے جان گلکرسٹ کی فرمائش پر ''مفرح القلوب'' کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اور اس کا نام ''اخلاق ہندی'' رکھا ہے۔ ''تاریخ آسام'' بھی ترجمہ ہے، یہ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی ''تاریخ آسام'' کا اردو ترجمہ ہے۔ ''رسالہ گل کرسٹ'' دراصل گل کرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' کا خلاصہ ہے۔

**مظہر علی ولا:** ولا کی تاریخ پیدائش اور وفات کے بارے میں معلوم نہیں، البتہ قیاس

کیا جاتا ہے کہ وہ ۱۸۱۳ء تک زندہ رہے۔ اس کے بعد ان کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔
مظہر علی ولا کا اصل نام مرزا لطف علی تھا لیکن عام طور پر مظہر علی خان کے نام سے مشہور ہیں۔ مظہر علی ولا کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہاں تربیت پائی۔ مظہر علی ولا نثر نگار اور شاعر تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی اس سے وابستہ ہو گئے۔ اُن کو اردو، سنسکرت اور فارسی پر مکمل دسترس حاصل تھی۔ قیام فورٹ ولیم کالج کے دوران انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔

''مادھونل کام کندلا'' عشق و محبت کا قصہ ہے، جس میں مادونل نامی ایک برہمن اور ایک رقاصہ کندلا کی داستانِ محبت بیان کی گئی۔ اس قصے کا اصل سنسکرت ہے۔ برج بھاشا میں اس قصے کو موتی رام کوئی نے لکھا ہے۔ ولا نے گل کرسٹ کی فرمائش پر اسے قصے کو برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ''ترجمہ کریما'' ولا کی دوسری کتاب ہے۔ جو شیخ سعدی کے مشہور ''پند نامہ'' کا منظوم ترجمہ ہے۔ ''ہفت گلشن'' بھی ترجمہ ہے۔ ولا نے گل کرسٹ کی فرمائش پر واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کو اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کتاب میں آدابِ معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر بات کی وضاحت کے لیے موزوں حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

''بیتال پچیسی'' ولا کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے ترجمے میں ''للولال'' بھی ان کے ساتھ شریک تھے۔ یہ پچیس کہانیاں ہیں جو برج بھاشا سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ کتاب میں فارسی کے الفاظ بہت کم ہیں۔ زبان ہندی آمیز ہے۔ اور سنسکرت کے الفاظ بکثرت ہیں، جس کی وجہ سے عبارت سلیس و عام فہم بھی نہیں۔ ''اتالیق ہندی'' کی تالیف میں ولا کے علاوہ کالج کے کچھ دوسرے اہلِ قلم بھی شریک تھے۔ یہ کتاب اخلاقی اسباق اور کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

مرزا کاظم علی جوان: کاظم علی جوان کی پیدائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مرزا کاظم علی جوان جن کا وطن دلی تھا۔ دلی کی تباہی کے بعد پھرتے پھراتے لکھنؤ آئے۔ لکھنؤ میں ان دنوں شعر و شاعری کی محفلیں گرم تھیں۔ بحیثیت شاعر انھوں نے بہت جلد مقبولیت حاصل کی۔ فورٹ

ولیم کالج میں کرنل اسکاٹ کی وساطت سے ملازم ہوئے۔۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔۳ جولائی ۱۸۱۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ان کی تصانیف میں "شکنتلا" مشہور کتاب ہے، جو کالی داس کے مشہور ڈرامے "شکنتلا" کا ترجمہ ہے۔اس کتاب میں جوان نے ہندوستانی معاشرت کی کہانی میں عربی اور فارسی کے الفاظ بلا تکلف استعمال کیے ہیں۔کتاب کی عبارت مجموعی طور پر روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہے۔

"بارہ ماسہ" میں جوان نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہواروں کا حال مثنوی کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

**خلیل خان اشک:** ان کے حالات زندگی معلوم نہیں۔فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۰۱ء میں وابستہ ہوئے۔اس کے بعد ان کی زندگی کے حالات پر مکمل پردہ پڑا ہوا ہے۔فورٹ ولیم کالج کی ملازمت کے دوران اشک نے چار کتابیں تالیف کیں، جن کے نام ہیں: داستانِ امیر حمزہ، اکبر نامہ، گلزارِ چین اور رسالہ کائنات۔لیکن ان کی مشہور کتاب "داستانِ امیر حمزہ" ہے۔اس کتاب میں اشک کی زبان بہت صاف اور سلیس ہے۔جگہ جگہ پر مصنف نے قافیے سے کام لیا ہے۔اور سیدھی سادی باتوں کو ادبی اور شاعرانہ انداز میں بیان کر کے اس کی دل کشی میں اضافہ کیا ہے۔نیز قصے میں مقامی معاشرت کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔یہ کتاب اس قدر مشہور ہوئی کہ ہر فرد اس کے نام سے واقف ہے، لیکن جس قدر کتاب کو شہرت حاصل ہوئی، اس قدر مصنف گم نامی میں چلا گیا۔

**نہال چند لاہوری:** نہال چند لاہوری کے اجداد کا تعلق دہلی سے تھا۔دلی کی تباہی کے بعد نہال چند لاہور چلے گئے۔اس لیے لاہوری کہلائے۔فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ایک کپتان کی وساطت سے ملازم ہوئے۔نہال چند لاہوری نے "گل بکاؤلی" کے قصے کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔مترجم نے اپنے ترجمے کو اصل سے قریب رکھتے ہوئے تکلفات سے بچنے کی کوشش کی ہے۔مترجم نے لفاظی کی جگہ سادگی اختیار کر کے قصے کو دلچسپ اور عام فہم بنا دیا ہے۔ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بنی نارائن جہاں: بنی نرائن کا وطن لاہور تھا۔ لاہور میں پیدا ہوئے والد کا نام لکشمی نرائن تھا۔ یہیں تعلیم حاصل کی۔ گردشِ زمانہ کے ہاتھوں کلکتہ پہنچے۔ سید حیدر بخش حیدری کی سفارش پر فورٹ ولیم کالج میں جگہ ملی۔ انھوں نے کل دو کتابیں تصنیف کیں۔

''چار گلشن'' ایک عشقیہ داستان ہے، جس میں شاہ کیواں اور فرخندہ کی محبت کا ذکر ہے۔ یہ کسی داستان کا ترجمہ نہیں بلکہ اُن کی اپنی طبع زاد ہے۔

''دیوانِ جہاں'' اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ یہ تذکرہ بنی نرائن جہاں نے کپتان روبک کی فرمائش پر مرتب کیا۔

ان مصنفین کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ کالج کے کچھ اور مصنفین بھی ہیں، جن کے نام ذیل میں درج ہیں:

مرزا جان طپش، میر عبداللہ مسکین، مرزا محمد فطرت، میر معین الدین فیض وغیرہ

## کالج کی خدمات

اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ انگریزوں نے یہ کالج سیاسی مصلحتوں کے تحت قائم کیا تھا۔ تاکہ انگریز یہاں کی زبان سیکھ کر رسم ورواج سے واقف ہو کر اہلِ ہند پر مضبوطی سے حکومت کر سکیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ فورٹ ولیم کالج شمالی ہند کا وہ پہلا ادبی اور تعلیمی ادارہ ہے، جہاں اجتماعی حیثیت سے ایک واضح مقصد اور منظم ضابطہ کے تحت ایسا کام ہوا جس سے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت ہوئی۔

اس کالج کے ماتحت جو علمی وادبی تخلیقات ہوئیں، جہاں وہ ایک طرف علمی وادبی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں تو دوسری طرف ان کی اہمیت وافادیت اس بنا پر بھی ہے کہ ان تخلیقات نے اردو زبان وادب کے مستقبل کی تعمیر وتشکیل میں بڑا حصہ لیا۔ خصوصاً ان تخلیقات نے اردو نثر اور

روش کو ایک نئی راہ پر ڈالا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل اردو زبان کا نثری ذخیرہ بہت محدود تھا۔ اردو نثر میں جو چند کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کی زبان مشکل، ثقیل اور بوجھل تھی۔ رشتہ معنی کی تلاش جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فارسی اثرات کے زیر اثر اسلوبِ نگارش، تکلف اور تصنع سے بھرپور تھا۔ ہر لکھنے والا اپنی قابلیت جتانے اور اپنے علم و فضل کے اظہار کے لیے موٹے موٹے اور مشکل الفاظ ڈھونڈ کر لاتا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو اس پُر تکلف اندازِ تحریر کے خارزار سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔ سادگی، روانی، بول چال اور انداز، معاشرے کی عکاسی وغیرہ اس کالج کے مصنفین کی تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی بدولت تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ ترجمے کی اہمیت بھی واضح ہوئی۔ منظم طور پر ترجموں کی مساعی سے اردو نثر میں ترجموں کی روایت کا آغاز ہوا اور انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو نثر میں ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں شروع ہوئیں، ان کے پسِ پردہ فورٹ ولیم کا اثر کارفرما رہا۔ فورٹ ولیم کالج کی بدولت تصنیف و تالیف کے کام میں موضوع کی افادیت اور اہمیت کے علاوہ اسلوبِ بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ یہ محسوس کیا گیا جس قدر موضوع اہمیت کا حامل ہے، اسی قدر اسلوبِ بیان، اسلوبِ بیان کی سادگی، سلاست اور زبان کا اردو روزمرہ کے مطابق ہونا ضروری ہے، تا کہ قاری بات کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مطالب کو سادہ، آسان اور عام فہم زبان میں بیان کیا جائے۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی مساعی کی بدولت اردو زبان بھی ایک بلند سطح پر پہنچی۔ فورٹ ولیم کالج کی اردو تصانیف سے قبل اردو زبان یا تو پُر تکلف داستان سرائی تک محدود تھی یا پھر اسے مذہبی اور اخلاقی تبلیغ کی زبان تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں اتنی وسعت اور صلاحیت ہے کہ اس میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، داستان، تذکرے، غرض یہ کہ ہر موضوع اور مضمون کو آسانی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

# انجمن ترقی اردو

جنوری ۱۹۰۲ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس علی گڑھ کے تحت ایک علمی شعبہ قائم کیا گیا، جس کا نام انجمن ترقی اردو تھا۔ مولانا شبلی نعمانی اس کے سیکرٹری رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں نواب حبیب الرحمن خان شیروانی اور ۱۹۰۹ء میں عزیز مرزا اس عہدے پر فائز ہوئے۔ عزیز مرزا کے بعد ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق سیکرٹری منتخب ہوئے۔ مولوی صاحب اورنگ آباد (دکن) میں ملازم تھے، وہ انجمن کو اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح حیدرآباد دکن اس کا مرکز بن گیا۔ انجمن کے زیر اہتمام لاکھ سے زائد جدید علمی، فنی اور سائنسی اصطلاحات کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ نیز اردو کے نادر نسخے تلاش کر کے چھاپے گئے۔ دو سہ ماہی رسائل، اردو اور سائنس جاری کیے گئے۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا گیا۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی انجمن ہی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ اس یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ انجمن نے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا، جہاں سیکڑوں علمی کتابیں تصنیف و ترجمہ ہوئیں۔

۱۹۳۶ء میں انجمن کو دلی منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اور ۱۹۳۸ء میں انجمن مع مولوی عبدالحق دلی آگئی۔ تقسیم ہند کے ہنگاموں میں انجمن کے کتب خانے کی بیشتر کتابیں ضائع ہوگئیں۔ مولوی صاحب کراچی آگئے اور اکتوبر ۱۹۴۸ء سے انجمن کا مرکز کراچی بن گیا۔ سر شیخ عبدالقادر انجمن کے صدر اور مولوی صاحب سیکرٹری تھے۔ ۱۹۵۰ء میں مولوی صاحب صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں انجمن نے اردو کالج قائم کیا۔ جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ مولوی صاحب کے انتقال (۱۹۶۱ء) کے بعد جناب اختر حسین صدر اور جمیل الدین عالی اعزازی سیکرٹری بنائے گئے۔ انجمن کی شاخیں پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ ابھی تک زندہ ہے۔

## تاریخ

انجمن ترقیِ اردو کی تاریخ برصغیر پاک و ہند میں خلوص، لگن، جد و جہد اور سعی و عمل کی تاریخ ہے۔ سرسید احمد خاں کے عہد میں مسلمان ۱۸۵۷ء کی ہزیمت سے سہمے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کو بھاری اکثریت کے ساتھ ساتھ فرنگی حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ چناں چہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھا کر یہ آواز بلند کی کہ عدالتوں کی ساری کارروائی ہندی زبان میں ہونا چاہیے۔ اس نعرے نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس سلسلے میں قوت اور اکثریت کے دباؤ دونوں سے کام لیا گیا۔ سرسید کو اس تحریک کے نقصان دہ اثرات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے یہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے آپ کو صرف مسلمانوں کے قومی کاموں کے لیے وقف کر لیا اور دو قومی نظریے کی ترویج و اشاعت کی۔ سرسید نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک بڑے زور و شور سے اردو زبان کی مدافعت جاری رکھی۔ اُن کے بعد اُن کے لائق جانشینوں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے یہ خدمت انجام دی۔ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک ادارہ ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے قائم کیا تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کے سالانہ جلسے ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی اور تعلیمی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔ ترقیِ اردو بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک مقصد تھا، جس کے حوالے سے کام ہوتا رہتا تھا۔ مگر یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی کہ ترقیِ اردو اور اردو کی مدافعت کے لیے ایک ہمہ جہت فعّال اور مستعد ادارے کی ضرورت ہے۔ ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ دلّی میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں کانفرنس کے مختلف شعبے قائم کیے گئے۔ انھیں شعبوں میں ایک شعبہ ترقیِ اردو کا بھی تھا۔ یہی شعبہ انجمن ترقیِ اردو کی بنیاد تھا۔

درج ذیل حضرات انجمن کے اولین عہدیدار نامزد ہوئے:

صدر، پروفیسر ٹامس آرنلڈ (علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے، اس وقت جامعہ نہیں بنی تھی)

نائب صدر، شمس العلما مولوی نذیر احمد

نائب صدر، شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی

نائب صدر، شمس العلما مولوی ذکاءاللہ

سیکریٹری، شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی

انجمن کا ابتدائی دور بڑی جد و جہد اور کشمکش کا دور تھا۔ کسی ادارے کو کامیاب اور روایت ساز بنانے کے لیے غیر معمولی محنت کرنا پڑتی ہے۔ انجمن کے عہدے داروں نے بڑی محنت کی اور انجمن کو ایک حیثیت دی لیکن دو تین برسوں کے وقفے سے یکے بعد دیگرے تین سیکریٹری مقرر ہوئے، اس وجہ سے کام کسی حد تک متاثر ہوا۔ مولانا شبلی کو اپنی مصروفیات کی وجہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ نواب صدر یار جنگ نے اُن کا کام سنبھالا۔ وہ بھی اپنی دوسری انتظامی مصروفیات کی وجہ سے مستعفی ہوگئے۔ مولوی عزیز مرزا سیکریٹری مقرر ہوئے۔ وہ بہت فعّال اور کارگزار انسان تھے۔ بڑے ذوق شوق اور محنت سے کام شروع کیا لیکن ۱۹۱۱ء میں اُن کا انتقال ہوگیا اور انجمن ایک مستعد سیکریٹری سے محروم ہوگئی۔

۱۹۱۲ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پھر دلّی میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں انجمن کی کارگزاری اور حالات پر بھی غور ہوا۔ یہ طے ہوا کہ مولوی عبدالحق (اس وقت صدر مہتمم تعلیمات اورنگ آباد) کو سیکریٹری مقرر کیا جائے۔ مولوی صاحب سرسید کے تربیت یافتہ تھے، محسن الملک کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ مولانا حالی کے عقیدت مند اور علمی، ادبی کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مولوی صاحب انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوگئے۔ انجمن کو اپنے ساتھ اورنگ آباد لے آئے اور رفتہ رفتہ اس صدی میں اردو زبان و ادب کی ترقی کی سب سے بڑی انجمن کا سب سے اہم حوالہ بن گئے۔ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری ہی نہیں مجسّم ترقی اردو تھے۔ اُن کا سونا جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، پڑھنا لکھنا، آنا جانا، دوستی، تعلقات، روپیہ پیسہ غرض کہ سب کچھ انجمن کے لیے تھا۔ ساری تنخواہ انجمن کی نذر کر دیتے (بعد میں پنشن بھی انجمن پر ہی خرچ کرتے رہے) لکھنے پڑھنے سے جو آمدنی ہوتی، وہ بھی انجمن کے کھاتے میں جاتی۔ زندہ رہے تو اردو کے لیے اور یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ کراچی کے جناح اسپتال میں بسترِ مرگ پر تھے مگر لیٹے لیٹے "قاموس الکتب" (جلد اوّل) کا معرکتہ آرا مقدمہ لکھ دیا۔ مولوی عبدالحق نے، جنھیں انجمن کے حوالے اور اردو کی خدمت سے خواص و عوام نے "بابائے اردو" کا خطاب دیا، انجمن کو غیر معمولی ترقی دی۔ اس کی خدمات کا دائرہ وسیع کیا۔ وقت کے

جدید تقاضوں کے مطابق علمی اور ادبی منصوبے مرتب کیے اور ان پر بڑی دل جمعی سے کام کیا۔ انجمن کے کاموں کی ایسی شہرت ہوئی کہ نظامِ دکن میر عثمان علی خاں نے ایک ذاتی فرمان کے ذریعے اس کی سرپرستی منظور کی اور اس کے لیے مستقل امداد جاری کر دی۔

## اُردو کی ترویج و اشاعت میں انجمن کا کردار

**مخالفتوں اور مشکلات کا دور:** انجمن نے ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت جنوبی ایشیا کے اُن علاقوں میں جہاں اردو کا رواج برائے نام تھا، اردو کو رواج دیا۔ اس مقصد کے لیے اسکول اور شبینہ مدارس قائم کیے، تعلیم بالغان کا انتظام کیا، چھوٹا ناگ پور کے علاقے میں جو مراکز قائم کیے گئے تھے، انھیں بڑی کامیابی ہوئی۔ جن علاقوں کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی تھی، وہاں انجمن نے اردو اساتذہ کے تقرر کا بندوبست کیا۔ درسی کتابیں شائع کیں، ناقص درسی کتابوں کی درستی کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ بابائے اردو نے سارے ملک کے متعدد دورے کیے۔ انجمن کے معاونوں اور حامیانِ اردو کا ایک بہت بڑا حلقہ مرتب کیا جس میں ملک کے تمام مقتدر اہلِ علم شامل تھے۔ بے شمار رضا کاروں نے شہر شہر قریہ قریہ شاخیں اور ذیلی شاخیں کھولیں، باقاعدگی اور تواتر کے ساتھ بڑے چھوٹے مذاکرے، جلسے اور منصوبے منعقد و مرتب ہونے لگے۔

**اصطلاحاتِ علمیہ اور انگریزی اردو ڈکشنری:** اردو زبان کو ہر سطح پر ذریعہ تعلیم بنانے اور علوم و فنون کے جدید سرمائے کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لیے انجمن نے اصطلاحاتِ علمیہ کے ترجموں کا کام کیا اور ترجموں میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ایک 'اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری' مرتب کی۔ یہ کام بابائے اردو کی سرکردگی میں ماہرین کی ایک جماعت نے انجام دیا۔ انجمن کی یہ ڈکشنری اب تک متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ بعض علوم کی اصطلاحات کی فرہنگیں علیحدہ سے بھی شائع کی گئیں۔ انجمن کے اس کام سے اصطلاحات کے ترجموں کی طرف توجہ عام ہوئی۔ اسی ذخیرے سے اسی ہزار اصطلاحات اردو بورڈ (اب اردو سائنس بورڈ لاہور) کو ہدیہ کی گئیں۔

**علمی و ادبی کتابوں کے تراجم:** انجمن نے دنیا کی اہم علمی اور ادبی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے ایک مرحلہ وار پروگرام کے تحت کام شروع کیا اور ایسی بے شمار کتابوں کے ترجمے شایع کیے، جنھیں اُمہات الکتب میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیسے الف لیلیٰ کا ترجمہ، مکالمات افلاطون، دانتے کی ڈوائن کامیڈی اور گوئٹے کے 'فاوسٹ' کا ترجمہ، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ تمدن، فلسفہ تعلیم، اور دیگر کئی اہم تراجم۔

**انجمن کے رسائل:** انجمن نے ۱۹۲۱ء جنوبی ایشیا کا وقیع سہ ماہی ''اردو''، ۱۹۲۸ء میں رسالہ ''سائنس'' اور ۱۹۳۹ء میں اخبار ''ہماری زبان'' جاری کیا۔

''اردو'' کا مقصد و منشا اردو ادب، اور اعلیٰ تحقیق کو فروغ دینا تھا۔ ''سائنس'' کے ذریعے سے اردو میں جدید دَور کے سائنسی افکار کی اشاعت ہوئی۔ ''ہماری زبان''، اردو زبان کے بارے میں تازہ ترین خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا۔

**املا کے قاعدے:** انجمن نے اعراب، اوقاف اور املا کے قواعد مرتب کیے اور اصلاحِ زبان کی کوشش کی۔ یہ ایک بڑا اہم اور کامیاب ترجمان ثابت ہوا۔

**قدیم کتابوں کی اشاعت:** انجمن نے اردو کی قدیم کتابوں کو جو مخطوطوں کی شکل میں مختلف افراد کے ذاتی اور عام کتب خانوں میں بکھری ہوئی تھیں مرتب کر کے شائع کیا اور ان پر مستند اہلِ علم سے مقدمے لکھوائے۔ دکن کے قدیم اردو ادیبوں اور شاعروں کو منظرِ عام پر لانا انجمن کا بہت بڑا عملی کارنامہ ہے۔

**شعرائے اردو کے تذکروں کی اشاعت:** انجمن نے شعرائے اردو کے قدیم تذکروں کو جنھیں اردو کی ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش کی حیثیت حاصل ہے، بڑی کوشش اور تلاش سے شائع کیا اور اردو کی ادبی تاریخ کو مکمل کیا۔

## اجمالی جائزہ

انجمن نے اردو کے خلاف اٹھنے والی ہر تحریک کا پامردی سے مقابلہ کیا اور مخالفین اردو کے عزائم کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا دفتر اورنگ آباد سے دلی منتقل ہو گیا مگر ۱۹۴۷ء کے فسادات میں انجمن کا سارا اثاثہ برباد ہو گیا۔ عمارت پر ایک بیمہ کمپنی نے قبضہ کر لیا۔ انجمن کا نادر اور قیمتی کتب خانہ لٹ گیا۔ مطبوعات ردّی میں فروخت کر دی گئیں اور کام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی۔ دلی میں انجمن کی تباہی اور بربادی کے بعد بابائے اردو کراچی چلے آئے۔ یہاں از سر نو انجمن کے کاموں کا آغاز ہوا۔ بے سروسامانی کے باوجود انجمن نے پاکستان میں نئے عزم اور حوصلے سے کام شروع کیا۔ مشہور ادیب اور ادیب گر سر شیخ عبدالقادر صدر منتخب ہوئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کو انجمن کے افتتاح کی دعوت دی گئی۔ قائداعظم نے یہ دعوت منظور کر لی اور لکھا کہ میں اپریل کے بعد کسی دن بہ خوشی انجمن کا افتتاح کروں گا۔ لیکن اُن کی مصروفیت اور پھر وفات کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر اور دوسرے اکابرین وقت نے انجمن سے تعلق جاری رکھا۔ سر شیخ عبدالقادر بھی جلد ہی انتقال فرما گئے۔ اب بابائے اردو انجمن کے صدر منتخب ہوئے اور اپنی وفات تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بابائے اردو کے بعد اختر حسین نے صدارت کی ذمے داری قبول کی اور اپنی وفات تک صدر رہے۔ اُن کے بعد قدرت اللہ شہاب صدر منتخب ہوئے۔ اُن کے انتقال کے بعد جناب نورالحسن جعفری انجمن کے صدر رہے اور ان کے انتقال کے بعد جناب آفتاب احمد خان انجمن کے صدر رہے۔

پاکستان میں انجمن کے معتمدین میں بھی بڑے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر معین الحق! جمیل الدین عالی، بابائے اردو کی حیات ہی میں رکن منتظمہ تھے۔ ان کے انتقال کے بعد معتمدِ اعزازی مقرر ہوئے۔ ۲۰۱۳ء میں انھوں نے ڈھلتی ہوئی عمر اور ناسازیِ طبع کی بنا پر یہ ذمہ داری معروف شاعرہ ڈاکٹر فاطمہ حسن کو سونپ دی۔ وہ انجمن کی معتمد منتخب ہونے والی پہلی خاتون ہیں۔

# انجمنِ پنجاب

سال ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ملک میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ اس تعطل کو دور کرنے اور زندگی کو از سرِ نو متحرک کرنے کے لیے حکومت کے ایما پر مختلف صوبوں اور شہروں میں علمی و ادبی سوسائٹیاں قائم کی گئیں ہیں۔ سب سے پہلے بمبئی، بنارس، لکھنؤ، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ایسی ہی ایک انجمن لاہور میں قائم کی گئی جس کا پورا نام "انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب" تھا، جو بعد میں "انجمنِ پنجاب" کے نام سے مشہور ہوئی۔

یہ انجمن کا قیام جنوری 1865ء میں عمل میں لایا گیا۔ اس انجمن کے قیام میں ڈاکٹر لائٹز نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ لاہور میں جب گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہوا ڈاکٹر لائٹز اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹز کو نہ صرف علوم مشرقی کے بقاء اور احیاء سے دلچسپی تھی بلکہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمت عملی کے مطابق انگریزی زبان کے ذریعے علوم سکھانے کا طریقہ عملی مشکلات سے دوچار تھا۔ ان باتوں کی بناء پر ڈاکٹر لائٹز نے اس خطے کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا فیصلہ کیا۔ اور انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کی داغ بیل ڈالی۔

## مقاصد

انجمن کے مقاصد میں قدیم علوم کا احیا، صنعت و تجارت کا فروغ، دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت، علمی ادبی اور معاشرتی و سیاسی مسائل پر بحث و نظر، صوبے کے بارسوخ طبقات اور افسران حکومت کا رابطہ، عوام اور انگریز حکومت کے درمیان موجود بدگمانی کو رفع کرنا شامل تھا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے مختلف مقامات پر مدارس، کتب خانے قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ رسائل جاری کیے گئے۔ سماجی اور تہذیبی، اخلاقی، انتظامی اور ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال کے لیے جلسوں کا اہتمام کیا گیا۔

رکنیت: انجمن پنجاب کے پہلے جلسے میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی، وہ سرکاری ملازم، روسا اور جاگیردار وغیرہ تھے۔ لیکن جلد ہی اس کی رکنیت عام لوگوں کے لیے بھی کھول دی گئی۔ اس انجمن کے اعزازی دائمی سرپرست پرنس آف ویلز تھے، جب کہ سرپرست گورنر پنجاب تھے۔ اس انجمن کے اراکین کی تعداد ۲۵۰ تھی۔

## انجمن کی سرگرمیاں

انجمن کے جلسے: انجمن کا اہم کام مختلف مضامین پر ہفتہ وار مباحثوں کا سلسلہ شروع کرنا تھا۔ چنانچہ جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو یہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اس کی بازگشت سرکاری ایوان میں بھی سنی جانے لگی۔ اس انجمن کے جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث ونظر کی عام اجازت تھی۔ جب کہ انجمن پنجاب کا جلسہ خاص بالعموم انتظامی نوعیت کا ہوتا تھا۔ اور اس میں صرف عہدہ دار شریک ہوتے تھے۔ لیکن جلسہ عام میں شریک ہونے اور دانش وروں کے مقالات سننے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس لیے انجمن پنجاب کی تحریک میں زیادہ اہمیت جلسہ عام کو حاصل تھی۔ اس انجمن کے ابتدائی جلسوں میں مولوی محمد حسین آزاد، پنڈت من پھول، ڈاکٹر لائٹز، بابو نوبین چندر رائے، بابو شاما چرن، مولوی عزیز الدین اور پروفیسر عملدار حسین وغیرہ نے مضامین پڑھے۔ ان میں سے بیشتر مضامین انجمن کے رسالے میں طبع ہوئے۔

محمد حسین آزاد انجمن کے لیکچرر: انجمن کے جلسوں میں جو دانش ور مضامین پڑھتے تھے، ان میں سے سب سے زیادہ مضامین محمد حسین آزاد کے پسند کیے گئے۔ اس لیے ڈاکٹر لائٹز نے انہیں انجمن کے خرچ پر مستقل طور پر لیکچرر مقرر کرنے کی تجویز منظور کروائی۔ جب محمد حسین آزاد کا تقرر اس عہدے پر کیا گیا تو آزاد نے موثر طور پر اپنے فرائض ادا کیے اور انجمن پنجاب کو ایک فعال تحریک بنا دیا۔ بحیثیت لیکچرار انجمن پنجاب میں محمد حسین آزاد کے ذمے یہ فرائض تھے کہ جو مضامین

جلسوں میں پڑھے جانے والے پسند کیے جاتے تھے، ان کو عوام میں مشہور کرنا، ہفتے میں دو تین لیکچر کمیٹی کے حسب منشا پڑھنا، تحریری لیکچروں کو سلیس اور دلچسپ اردو میں پیش کرنا اور انجمن کے رسالے کی طباعت اور ترتیب مضامین وغیرہ کی درست شامل تھے۔

ان فرائض کی وجہ سے انجمن میں انھیں ایک کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی۔ لیکچروں کی ترتیب وتنظیم، مجالس کا انتظام، مضامین کی قرأت اور اشاعت...... غرض یہ کہ انجمن پنجاب کے تمام امور عملی انجام دہی، آزاد کی ذمہ داری تھی۔ آزاد نے اس حیثیت سے اتنی عمدہ خدمات انجام دیں کہ محمد حسین آزاد ادبی پیش منظر پر نمایاں ہوگئے۔ محمد حسین آزاد نے انجمن کے جلسوں میں ایک جدت یہ کی انھوں نے جلسے کے اختتام پر روایتی مشاعرے کا اضافہ کردیا تھا۔ اس سے عوامی دلچسپی زیادہ بڑھ گئی تھی۔

انجمن کے مشاعرے: انجمن پنجاب کی شہرت کا سب سے بڑا سبب انجمن کے مشاعرے تھے۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کا آغاز مئی ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مشاعروں کی بنیاد کرنل ہالرائیڈ، ناظم تعلیمات پنجاب کی تحریک سے ہوئی۔ اس زمانے میں غزل کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ جب کہ غزل کے بارے میں آزاد کا خیال تھا کہ غزل کی طرز میں ایک خیال اول سے آخر تک اچھی طرح تضمین نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے اجلاس منعقدہ ۱۸۷۶ء میں ایک لیکچر بعنوان "خیالات درباب نظم اور کلام موزوں" دیا تھا۔ اور اختتام پر اپنی مشہور نظم "شب قدر" پڑھ کر سنائی۔ اس نظم سے مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ اگر شاعر سلیقہ رکھتا ہو تو ہجر و وصال عشق و عاشقی، شراب و ساقی اور بہار و خزاں کے علاوہ مناظر فطرت کو بھی شاعری کا موضوع بنایا جاسکتا ہے۔ آزاد کی تقریر اور ان کی نظم اس قدر دل پذیر تھی کہ جلسے کے اختتام پر محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ نے اس کی بے حد تعریف کی اور فرمایا: "اس وقت مولوی صاحب نے جو مضمون پڑھا اور رات کی حالت پر اشعار سنائے وہ بہت تعریف کے قابل ہیں۔ یہ نظم ایک عمدہ نظام کا طرز ہے جس کا رواج مطلوب ہے۔"

کرنل ہالرائیڈ کے آخری جملے سے بالعموم یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ نظم جدید کی ترویج کرنل ہالرائیڈ کی ایما پر ہوئی۔

**مشاعروں کا پس منظر:** مشاعروں کا سیاسی پس منظر یہ بتایا جاتا ہے کہ اگست ۱۸۸۱ء کو وائسرائے ہند نے ملک کے مختلف صوبہ جات کے پاس ایک آرڈیننس بھیجا، جس میں کہا گیا تھا کہ سرکاری سکولوں میں مسلمانوں کی قدیم زبانوں اور نیز دیسی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔ مسلمان اساتذہ مقرر کیے جائیں اور عربی فارسی کی تعلیم میں اضافہ کیا جائے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ وائسرے ہند کے اس حکم کی تعمیل میں پنجاب کے گورنر نے جب سرکاری سکولوں میں پڑھائی جانے والی اردو کتابوں کو دیکھا تو انھوں نے ان کتابوں میں نظموں کی کمی کو محسوس کیا۔ اس کمی کی بنا پر گورنر نے دیسی نظموں کی ترویج کی خواہش ظاہر کی۔ گورنر کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ نے اردو نظم کے سلسلے میں مشاعروں کی تحریک شروع کرنے کا ارادہ کیا اور اس ضمن میں انھوں نے محمد حسین آزاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جو اس وقت ناظم تعلیمات پنجاب کے دفتر سے منسلک تھے۔

**جدت:** انجمن پنجاب کے زیر اہتمام جو مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے۔ ان میں ایک نئی جدت کی گئی تھی کہ ان مشاعروں کے لیے طرح مصرعہ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ نظموں کے عنوان مقرر کیے جاتے تھے اور شعرا حضرات ان موضوعات پر طبع آزمائی کرتے اور ان موضوعات پر نظمیں لکھ کر لاتے اور مشاعرے میں سناتے۔

**مشاعروں کی تفصیل:** انجمن پنجاب کے مشاعروں کا آغاز ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ پہلا مشاعرہ مئی ۱۸۷۴ء کو منعقد ہوا۔ اس مشاعرے کے لیے کرنل ہالرائیڈ کی تجویز کے مطابق نظم کا موضوع "برسات" رکھا گیا۔ اس مشاعرے میں مولانا حالی نے پہلی بار شرکت کی اور اپنی مشہور نظم "برکھارت" سنائی تھی۔ محمد حسین آزاد نے بھی برسات کے موضوع پر نظم سنائی تھی۔ مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد کے علاوہ اس پہلے مشاعرے میں شرکت کرنے والے شعرا میں الطاف علی، ذوق کاکوروی وغیرہ شامل تھے۔

اس مشاعرے کے انعقاد کے بعد انجمن پنجاب کے زیر اہتمام موضوعی مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشاعروں کا سلسلہ ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء سے شروع ہوا اور مارچ ۱۸۷۵ء تک جاری رہا۔ اس دوران کل دس مشاعرے ہوئے اور جن موضوعات پر مشاعروں میں نظمیں پڑھی گئیں، ان میں برسات، زمستان، امید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب، اور اخلاق شامل تھے۔

ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرا کے ناموں پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالیؔ کے علاوہ کوئی دوسرا صف اول کا شاعر شریک نہیں ہوا۔ حالی بھی انجمن کے صرف چار مشاعروں میں شریک ہو سکے تھے۔ کیونکہ بعد میں وہ دہلی چلے گئے تھے۔ ان مشاعروں میں مولانا الطاف حسین حالی نے جو نظمیں پڑھی تھیں۔ ان کے نام یہ ہیں؛ ''برکھارت''، ''نشاطِ امید''، ''حب وطن'' اور ''مناظرِ رحم وانصاف''۔

لاہور سے دلی چلے جانے کے بعد مولانا الطاف حسین حالی نے نظمیں لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ انھوں نے جو نظمیں لکھیں، ان میں مسدسِ حالی، مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد اور شکوۂ ہند، واعظ و شاعر، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں محمد حسین آزاد نے جو نظمیں پڑھیں، ان میں شب قدر، صبح امید، ابرِ کرم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کے ذریعہ نظموں کا ایک وافر ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جس نے آنے والے دور میں نظم کی تحریک اور جدید شاعری کے رجحان کی رہنمائی کی۔

## ادب پر اثرات

انجمن پنجاب نے ادب پر جو گہرے اثرات مرتب کیے، ان کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہو چکا ہے کہ انجمن پنجاب کے قیام کا بنیادی مقصد قدیم مشرقی علوم کا احیا اور باشندگانِ ملک میں دیسی زبان کے ذریعے علوم مفیدہ کی اشاعت وغیرہ تھی۔ اس کے لیے طریقہ کار یہ اپنایا گیا کہ انجمن کے جلسوں میں مضامین پڑھے جاتے تھے اور اس طریقہ کار کا بڑا فائدہ ہوا۔ اور اردو ادب پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

**مجلسی تنقید کی ابتدا:** انجمن کے جلسوں میں پڑھے گئے مضامین پر بحث وتنقید کی مکمل اجازت تھی۔ انجمن کے اس طریقہ کار کی وجہ سے شرکائے جلسہ کو بحث میں حصہ لینے علمی نقطہ پیدا کرنے اور صحت مند تنقید کو برداشت کرنے کی تربیت ملی۔ ہندوستان میں مجلسی تنقید کی اولین روایت کو اسی انجمن نے فروغ دیا۔ علمی امور میں عالی ظرفی، کشادہ نظری اور وسعت نظر کے جذبات کی ترویج کی گئی۔ چنانچہ بیسویں صدی میں جب حلقہ ارباب ذوق کی تحریک چلی تو اس میں بھی مجلسی تنقید کے اسی انداز کو اپنایا، جس قسم کے تنقید کی بنیاد انجمن پنجاب نے ڈالی تھی۔ اسی کے نتیجے میں پھر حالی نے اردو تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' لکھی۔

**نیچرل شاعری کا آغاز:** انجمن پنجاب کے مشاعروں کی وجہ سے اردو میں نیچرل شاعری کا رواج ہوا۔ نیچرل شاعری سے مراد یہ ہے کہ ایسی شاعری جس میں مبالغہ نہ ہو، صاف اور سیدھی باتوں کو اس انداز سے بیان کیا گیا جائے کہ لوگ سن کر لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے اپنی نظمیں پڑھ کر اردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی جس کا بعد میں اسماعیل میرٹھی نے تتبع کیا۔ حالی کی نظم ''برکھا رت'' سے اس کی مثال ملاحظہ ہو:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
تھی لوٹ سی پڑی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی بن میں
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال
کملائے ہوئے تھے پھول سے گال

**اردو شاعری میں انقلاب:** انجمن کے مشاعروں نے اردو شاعری میں ذہنی،

فکری اور تہذیبی انقلاب پیدا کیا۔ حب الوطنی ، انسان دوستی ، مروت ، محنت ، اخلاق اور معاشرت کے مختلف موضوعات کو ان مشاعروں کا موضوع بنایا گیا۔ چنانچہ ان مشاعروں نے فرضی، خیالی اور رسمی عشقیہ شاعری کو بدل کر رکھ دیا۔ مبالغہ آمیز خیالات کو چھوڑ کر ہر قسم کی فطری اور حقیقی جذبات کو سادگی اور صفائی سے پیش کرنے پر زور دیا، جسے اس زمانے میں نیچرل شاعری کا نام دیا گیا۔

**مناظر قدرت:** مناظر قدرت کا نظموں میں بیان اگرچہ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ ہی یہ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی پیداوار ہے۔ اس کے متعدد نمونے ہمیں نظیر اکبرآبادی کے ہاں ملتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعروں سے قبل مناظر قدرت نے کوئی مستقل حیثیت پیدا نہیں کی تھی۔ اور نظیر کے علاوہ کسی دوسرے شاعر نے اس طرف توجہ نہیں کی تھی۔ لیکن اس میں مناظر قدرت کے بیان نے ایک مستقل صورت اختیار کی اور اس کا سنگ بنیاد سب سے پہلے انجمن پنجاب کے مشاعرہ میں مولانا حالی نے رکھا۔ مولانا حالی نے "برکھا رت" کے نام سے جو نظم لکھی اس میں برسات کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کھینچ کر فطرت کی ترجمانی کی۔ جب کہ آزاد نے "ابر کرم" میں قدرت کے مناظر کی عکاسی کی۔ بعد کے شعرا میں اسماعیل میرٹھی، شوق قدوائی، بے نظیر نے مناظر فطرت پر اچھی نظمیں لکھیں۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولہا بنے ہوئے اشجار

**حب وطن:** حب وطن کے جذبات قدیم شاعری میں محدود پیمانے پر ملتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وطنی شاعری کی وسیع پیمانے پر بنیاد انجمن پنجاب کے مشاعروں کی مرہون منت ہے۔ اس عنوان پر مولانا حالی اور محمد حسین آزاد نے نظمیں لکھیں۔ ان بزرگوں کے بعد چکبست

، علامہ اقبال اور سرور جہاں آبادی نے حب وطن کے جذبات کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا۔ ذیل میں حالی کی نظم "حب وطن" کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

تم ہر ایک حال میں ہو یوں تو عزیز
تھے وطن میں مگر اور ہی چیز
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی
جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
اے وطن اے میرے بہشت بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین

**اخلاقی شاعری:** اردو میں اخلاقی شاعری کا عنصر زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن حالی اور آزاد کے دور میں برصغیر کے حالات و واقعات نے بڑی تیزی کے ساتھ پلٹا کھایا۔ ان بزرگوں نے قوم کو اخلاقی سبق سکھانے اور افراد قوم کو سعی کوشش، صبر و استقلال اور محنت و مشقت سے کام لینے کی تلقین کرنی پڑی۔ چنانچہ محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور اسماعیل میرٹھی نے ان عنوانات پر بہ کثرت نظمیں لکھیں۔

**حالی کے ادبی مزاج میں تبدیلی:** انجمن پنجاب کے مشاعروں کے اثرات نے مولانا حالی کے مزاج کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان مشاعروں کے آغاز سے قبل مولانا حالی عیسائی پادری عماد الدین کے ساتھ مناظروں میں الجھے ہوئے تھے۔ لیکن ان مشاعروں نے ان کا مزاج بدلا اور وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور "مدوجزر اسلام" جیسی طویل نظم لکھ ڈالی۔

اس طرح مجموعی طور دیکھا جائے تو انجمن پنجاب نے اردو ادب میں جدید شاعری اور تنقید پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ اردو نظم کی موجودہ شکل اسی ادارے کی بدولت ہے۔ بعد میں آنے والے شعراء اسی روایت کو آگے لے کر چلے اور اسے مزید آگے بڑھایا۔

# مجلس ترقی ادب

اردو ادب کے نام پر قائم اداروں میں مجلس ترقی ادب کو خاص مقام حاصل ہے، جس کی ایک وجہ اس ادارے کا کلاسیکی ادب کو تواتر سے چھاپنا ہے۔

اس ادارے میں امتیاز علی تاج، پروفیسر حمید احمد خان، احمد ندیم قاسمی اور شہزاد احمد جیسی قابل قدر علمی وادبی شخصیات کو سربراہ کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔ سردست ڈاکٹر تحسین فراقی کے ہاتھ میں اس ادارے کی زمام کار ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں میرٹ کا قتل عام سی بات ہو وہاں پچاس برس سے زاید عرصہ کسی ادارے کے سربراہ کا میرٹ پر تقرر ہوتے چلے جانا، ادارے کے وقار کی علامت ہے۔

معروف ادیب اور ڈرامہ نویس، یونس جاوید جنھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور بعد ازاں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ وہ اکتیس سال تک مجلس ترقی ادب لاہور کے ماہنامہ جریدے ''صحیفہ'' کی ادارت کرتے رہے۔ انھوں نے میٹرک کرنے کے بعد ہی مجلس ترقی ادب میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ اس وقت امتیاز علی تاج اس کے ڈائریکٹر تھے۔ بعد میں حمید اللہ خان ڈائریکٹر کے عہدے پر متمکن ہوئے۔

اس ادارے کے قیام میں، اکابرین کو خاصی تگ و دو کا سامنا کرنا پڑا۔ قانونی تقاضے پورے ہونے کے بعد لاہور میں یہ جگہ، جہاں پر ادارہ ثقافت اسلامیہ، بزم اقبال اور مجلس ترقی ادب کے دفاتر قائم ہیں، قیمتاً خریدی گئی۔ پچاس برس سے اس ادارے سے وابستہ محمد منیر نے جولائی ۲۰۱۴ء میں ایک اخبار کو انٹرویو دیا۔ اخبار نے لکھا کہ، وہ زورآوروں کی طرف سے مجلس کی زمین پر ہونے والے قبضے سے بھی خوب واقف ہیں، لیکن اس بارے میں کھل کر بات کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اس بابت بتایا تو بس اتنا کہ، ''ارباب اختیار کو سب پتا ہے۔ اس زمین کو خریدنے کے لیے جو بھاگ دوڑ ہوئی، اس میں میں، یونس شریک رہا کہ پٹواری اور ریونیو بورڈ کے دفتر میں جاتا رہا۔ اس جگہ کے لیے آدھی رقم مجلس نے اور آدھی رقم ادارہ ثقافت اسلامیہ نے دی۔''

ادھر کام کے دوران ہی انھیں امتیاز علی تاج کے بہیمانہ قتل کی خبر سنی پڑی، جن کے ساتھ پانچ برس کام کے دوران ان کا بہت اچھا تعلق رہا۔ اس دفتر ہی میں سقوطِ ڈھاکا کے بعد حمید احمد خان کو دل گرفتہ پایا۔ اس وقت سو جود تھے، جب ایک بیوروکریٹ نے احمد ندیم قاسمی جیسے نجیب شخص سے بدتمیزی کی، اور ان کے خلاف انکوائری کراتا پھرا، مگر کچھ ثابت نہیں کر سکا۔ قاسمی صاحب پر "فنون" کے سلسلے کا کام مجلس کے دفتر میں کرنے کے الزام کو بھی رد کرتے ہیں۔

اس ادارے کی خوش قسمتی رہی کہ بڑے علمی قد کاٹھ کی حامل شخصیات کو معاملات چلانے کا اختیار رہا۔ ان میں سے، ہر ذرہ آفتاب تھا۔ امتیاز علی تاج، حمید احمد خان اور احمد ندیم قاسمی کے برتاؤ کا آج بھی بڑے اچھے لفظوں میں ذکر ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مجلس کو اگر مناسب گرانٹ ملتی رہتی تو کارکردگی اور بھی بہتر ہوتی۔

اس ضمن میں احمد ندیم قاسمی نے کوشش تو بہتیری کی، لیکن اربابِ اختیار کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شہزاد احمد کا دور اس اعتبار سے مبارک ثابت ہوا کہ گرانٹ میں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑھوتری ہوئی۔ کتابوں کی اشاعت میں تیزی آگئی۔ کتابوں کی فروخت میں قابلِ قدر اضافہ ہوا اور تین چار لاکھ کی سالانہ سیل پندرہ سولہ لاکھ تک بھی پہنچ گئی۔ شہزاد احمد کے دور میں لائبریری کو نئی زندگی مل گئی۔ جو ادارے اس کا صحیح طریقے سے استعمال ہوا۔

مجلس ترقی ادب نے کلاسیکی ادب کی بہترین کتابوں کو دوبارہ شائع کیا۔ تحقیق و تدوین کا بہترین معیار پیش کیا۔ کلب علی خان فائق اور سید عابد علی عابد جیسے عالم لوگوں نے کتابوں پر کام کیا۔ تجارتی مقاصد اس ادارے کے کبھی نہیں رہے۔

یہی بات ایک بیوروکریٹ کی سمجھ میں نہیں آئی، جو قاسمی صاحب سے اس لیے الجھا کہ اس کے خیال میں ادارے نے اتنے برسوں میں کوئی ترقی نہیں کی۔ قیمتیں بہت مناسب ہیں۔ اگر یہی کتابیں کوئی غیر سرکاری ادارہ چھاپے، تو لوگوں کے لیے انھیں خریدنا مشکل ہو جائے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ پہلے کے مقابلے میں اب یہاں عام قارئین زیادہ آتے ہیں یا کم، تو منیر احمد کے بقول، بات یہ ہے کہ اس تعداد میں خاص فرق نہیں پڑا۔ ہم نے خریداری کے حساب سے

رعایت کا بھی طریقہ کار وضع کیا ہوا ہے۔"

کتابوں کی اشاعت سے ہٹ کر مجلس ترقی ادب نے نہایت عمدہ پرچہ "صحیفہ" بھی نکالا، جو گذشتہ پچاس برس سے بھی زائد عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے جید لوگ اس رسالے کے ایڈیٹر رہے۔ "صحیفہ" کا اشاریہ بھی کتابی صورت میں چھاپا گیا ہے، جس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس قدر اہم تحقیقات اس رسالے میں چھپتی رہی ہیں۔

اب بھی یہ ادارہ کلاسیکی ادب کی کتابیں چھاپ کر اردو کی خدمت کر رہا ہے، جن میں فورٹ ولیم کالج کے عہد میں لکھی گئی اردو کی ابتدائی کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

maablib.org

# استفادی کتب


| | | |
|---|---|---|
| آبِ حیات | محمد حسین آزاد | الحمد پبلی کیشنز، لاہور |
| اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ | ڈاکٹر سلیم اختر | سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور |
| اردو ادب کی تاریخ و تنقید | احتشام حسین | مکتبہ دانیال، کراچی |
| اردو ادب کی تحریکیں | ڈاکٹر انور سدید | انجمن ترقی اردو، کراچی |
| اردو نثر کا فنی ارتقا | ڈاکٹر فرمان فتح پوری | الوقار پبلی کیشنز، لاہور |
| پنجاب میں اردو | حافظ محمود شیرانی | ترقی ادب، لاہور |
| تاریخ ادبِ اردو | رام بابو سکسینہ | سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور |
| ترقی پسند ادب | علی سردار جعفری | مکتبہ دانیال، کراچی |
| تنقیدی دبستان | ڈاکٹر سلیم اختر | سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور |
| علی گڑھ تحریک | ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ | بیکن بکس، ملتان |


maablib.org

# اُردو ادب کے سلسلے کی دیگر کتابیں

تاریخ زبان و ادب اُردو

اُردو شاعری بیسویں صدی میں

میرؔ و غالبؔ کا خصوصی مطالعہ

تنقید نگاری

زیرِ ترتیب:

اقبالیات

بلوچستان میں اردو شعر و ادب کی روایت

ترتیب و تدوین:

عابد میر

زیرِ اہتمام:

گوشۂ ادب، کوئٹہ

# ضروری کتابیں ہر گھر اور لائبریری کے لئے

**گل خان نصیر**

- کوہ و بلوچ
- تاریخ خوانین قلات
- بلوچستان کے سرحدی چھاپہ مار
- بلوچستان قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں
- تاریخ بلوچستان

**طاہر بزنجو**

- گریٹ گیم اور بلوچستان
- بابائے بلوچستان
- بلوچستان تاریخ سیاست اور سماجی عوامل

**شکیل احمد بلوچ**

- بلوچستان اور عالمی سیاست
- بلوچستان کی پکار

**شاہ محمد مری**

- بلوچ قوم قبائلی اور جاگیرداری عہد
- بلوچ قوم۔ نوآبادیاتی عہد
- سیاہ گلی
- سورج کا شہر گوادر
- بلوچی زبان و ادب
- کامن سینس
- میر یوسف عزیز مگسی
- شیروین قوم میں

**مجید اصغر**

- مقدمہ بلوچستان

**زعیم بخاری اور اکبر ساسولی**

- معلومات بلوچستان

**مرتبہ زعیم بخاری**
**خلیل جبران**

- آگہی، جنت، دوزخ
- دیوان خلیل جبران
- النبی، انسان ابن آدم
- طوفان، روحیں باغی
- فلسفہ شاعری نظمیں
- خواب و خیال
- کلیات جبران (دو جلد)

**بلوچستان کے قبائل**

- بلوچستان کے قبائل (مکمل)
- کوہ سلیمان کے بلوچ (1)
- ساراوان، مکی، بھوان اور جھالاوان (2)
- سبی اور لاشی، سبی اور مری بگٹی (3)
- چاغی، خاران، مکران (4)
- بلوچ پشتون قبائل۔ مجموعہ (5)
- بلوچستان آئینہ قبائل اور تاریخ
- بلوچستان تاریخ کے آئینے میں
- بلوچستان اور دستوری جھگڑے
- تاریخ بلوچ قوم اور خوانین بلوچ
- بلوچستان کی معروف شخصیات کا
  انسائیکلوپیڈیا (3 جلد)
- ثقافت و ادب وادی بولان میں
- بگٹی نامہ (دو جلد)
- شہید بلوچستان نواب اکبر بگٹی حیات و خدمات
- نواب شہید اکبر بگٹی زندہ ہیں
- نواب اکبر بگٹی شہید ہو کر امر ہو گئے
- نواب اکبر بگٹی قتل کیسے کیا گیا
- نواب اکبر بگٹی
- مختصر حیات (سوانح نواب اکبر بگٹی)
- تاریخ قلات
- تاریخ بلوچ و بلوچستان
- مری بلوچ قبیلہ
- گوادر
- تاریخ بلوچستان
- سیستان اور بلوچستان
- سیاحت بلوچستان
- بلوچستان کے تاریخی شہر
- بلوچستان مسئلہ کیا ہے
- نواب خیر بخش مری (انٹرویو)
- قومی تحریکیں اور بلوچستان
- پاکستان، بلوچستان تاریخ کے تناظر میں
- احمد شاہ ابدالی
- پشتونوں کی تاریخ
- پشتونوں کے رسم و رواج

**ترتیب منصور بخاری**

- لاجواب افسانے
- عظیم افسانے
- لازوال اردو افسانے
- انمول افسانے
- نایاب افسانے
- گراں قدر افسانے
- جگمگاتے افسانے
- بیمثال افسانے
- سدابہار افسانے
- لافانی افسانے
- شہرت یافتہ افسانے
- لازوال افسانے
- جنگ نامہ
- جنگ عظیم دوم
- عالمی ادب سے انتخاب۔ دوستووسکی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ چیخوف
- عالمی ادب سے انتخاب۔ گورکی
- عالمی ادب سے انتخاب۔ بالزاک
- سو بہترین افسانے
- سرگزشت اسیر
- قلب الوطن
- سارے سخن ہمارے (کلیات ساحر)
- ولایت نگر کے افسانے

**گرو رجنیش اوشو**

- کلیات اوشو
- تعلیمات
- روحانیت کی جانب
- علم انقلاب اور آزادی
- زندگی، موت اور محبت

**ابوالکلام آزاد**

- آزادی ہند

**عبدالصمد خان اچکزئی**

- آزادی کے نقش

**محمود خان اچکزئی**

- معرکہ سیاست

Gosha-o-Adab
www.goshaeadeb.com

Rs 295/-

ISBN 978-969-6820-11-6